مکمل ناول

نایاب جیلانی

تیسری قسط

اسے گیندے کے پھولوں سے سجی لڑکیوں والے نقش جھولے پہ بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے ارد گرد کزنز کا جھرمٹ تھا اور ڈھولک کی تھاپ پہ اب بھی شادمانی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ اسے رسم کے لیے باہر لایا گیا تھا۔ اور اس وقت گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجی فریحہ دیکھنے والوں کو بھی گیندے کا کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔

لیکن اس وقت فریحہ کے چہرے پہ کوئی وہم، وسوسہ یا خدشہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک البیلی مسکان نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ وہ دھیما دھیما مسکراتی بہت سوں کو انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔

عاشر نے اس کے کئی پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیے تھے۔

جب رسم شروع ہونے لگی تو فریحہ کی امی نے تائی سے کہا۔

"ابھی تک عون نہیں آیا؟"

"آتا ہی ہو گا۔ رستے میں ہے۔ کہہ رہا تھا کہ فرض ادا کرنے گیا ہوں۔ بڑا ضروری فرض تھا۔ آنے والی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے۔" جواب قریب کھڑے عاشر نے دیا تھا۔ تائی اور فریحہ کی امی مطمئن ہو گئی تھیں۔ پھر وہ کیمرہ اٹھا کر اسٹیج پہ چڑھ آیا۔ فریحہ کی ابہام اور وسوسے بھی دور کرنے تھے۔ اسے دیکھ کر فریحہ نے اپنی سچویشن کی پروا کیے بغیر جھٹ سے شکوہ کیا۔

"دیکھ لو، تمہارا بھائی آج بھی نہیں پہنچا۔"

"دس منٹ میں پہنچنے والا ہے۔ تم خاطر جمع رکھو۔" اس نے قریب سے کیمرہ فوکس کیا اور کھٹ کھٹ دو تین تصویریں بنا لی تھیں۔

"میرا بھائی تمہارے سارے شکوے دور کر دے گا۔" عاشر نے شرارتاً کہا۔

"رہنے دو، کیا میں اسے جانتی نہیں...." فریحہ خفا ہوئی۔

"تم جانتی ہی تو نہیں۔" وہ ایک اور تصویر بناتا ہوا بولا تھا۔ "اور تم تو منہ بند رکھو.... سارے دانت نظر آ رہے ہیں۔" اس نے فریحہ کو بے ساختہ ڈپٹا۔ معاً پنڈال میں عون آتا دکھائی دیا تھا۔ اسے دیکھ کر لڑکوں اور لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کر دی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا اسٹیج کی طرف ہی آ رہا تھا۔ عاشر نے اسے رستے میں جا لیا۔

"جا ذرا اپنی شکل بدل کے آ، یہ بو والے کپڑے چینج کر، حد ہے گندا سندا اٹھ کے چلا آیا۔"

"شیروں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں۔" کسی نے عون کا کندھا تھپکا تھا۔

"آج گندا رہے گا تو کل روپ بھی چڑھے گا۔ تازہ شیو شوف بنا کر۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اس پہ تو ابھی بھی روپ ہے ماشاءاللہ۔ رف اینڈ ٹف حلیے میں بھی۔" عون کی خالہ نے قربان ہوتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"تو پھر اسٹیج پہ جانے دیں۔" عون نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ گویا تیار شیار ہونے کا موڈ نہیں تھا۔

"ہرگز نہیں۔" کائنات اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں طلوع ہوئی تھی یوں کے پورے اسٹیج کا

گھیراؤ کر لیا تھا۔ عون ہکا بکا رہ گیا۔
"یہ کیا؟"
"اسٹیج پہ چڑھنے کا ٹیکس دیں؟" اس نے ہتھیلی پھیلا رکھی تھی۔
کائنات کے برابر ثنا اور مریم بھی تن کے کھڑی ہو

گئیں۔ یک نہ شد، تین تین شد... وہ تو چکرا گیا تھا۔ ان کے جھرمٹ نے پیچھے موجود فریحہ کو چھپا دیا تھا۔ اس نے گردن اچکا کر پیچھے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ فریحہ دبا دبا سا مسکرا رہی ہے۔
"نکالو بھی... یہ ٹیکس تو ادا کرنا ہو گا۔ قومی خزانہ آج کل خالی ہے۔" ثنا نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔
"میں کیوں دوں؟ کیا قاسم اور عاصم نے دیا تھا؟" وہ

چڑ کر بولا تھا۔

"ہماری دفعہ یہ رسم ایجاد نہیں ہوئی تھی۔" مریم نے تنک کر کہا۔

"میری دفعہ کیوں ہوئی ہے؟" عون نے ٹیکس دینے پہ صاف کنجوسی دکھائی تھی۔

"اب تو ہر دفعہ ہو گی۔ عاشر کی باری میں مزید نئی رسومات سامنے لائیں گے۔ یاسر اور عامر کی دفعہ کچھ اور رسمیں انٹروڈیوس کروائیں گے۔" ثنا نے اپنی طویل کاروباری پرافٹ ایبل پلاننگ ان کے گوش و گزار کی تھی..... پوری پنڈال میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔

"یہ فاؤل ہے..... فاؤل ہے۔" لڑکوں نے خوب احتجاج کیا تھا۔ عون کو جان چھڑوانی مشکل لگ رہی تھی۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کس طرح سے پیچھا چھڑوائے؟ وہ سوچتا رہا تھا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا۔

"اوکے' اوکے..... میں شاور لے لوں' چینج کر آؤں ..... پھر ٹیکس کی رقم طے کریں گے بولو منظور؟" اس نے کائنات اور بھابھیوں سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پیچھا چھڑوا لیا تھا۔ پھر بالوں میں ہاتھ پھیرتا پنڈال سے باہر نکلا..... معاً" آندھی و طوفان کی طرح آتے قاسم نے اس کا بازو دبوچا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے عون کو کھینچتا پنڈال سے دور بہت دور لے آیا۔

عون اس افتاد پہ اچانک بوکھلا گیا تھا۔ قاسم کے تیور انتہائی خطرناک تھے اور عاصم کے تاثرات بھی کم و بیش ایسے ہی تھے۔

عون کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا؟ اس کی چھٹی حس کوئی مثبت الارم نہیں دے رہی تھی۔

اس نے بڑے دونوں بھائیوں سے وجہ جاننے کی کوشش میں لب کشائی کی تھی یوں کہ وہ دونوں کسی بپھرے شیر کی طرح بڑے خوفناک انداز میں غرائے تھے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا عون! اپنے باپ دادا کی عزت کو خاک میں ملا کر بالکل اچھا نہیں کیا..... تم نے ہمیں کسی قابل نہیں چھوڑا..... تم نے ابو کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا ہے..... تم نے ابو کو پورے خاندان' برادری' رشتے داروں' عزیزوں اور احباب کے سامنے ذلیل کر دیا ہے تم نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔" قاسم کے آگ بھرے یہ الفاظ عون کے دماغ کو دہکتے الاؤ' جلتی بھٹی اور شعلوں کے سپرد کر گئے تھے۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آخر عون نے کیا کیا تھا؟ اس سے کون سا گناہ سرزد ہوا تھا؟ اسے کچھ بتایا نہ گیا۔ وہ سارے رستے پوچھتا رہا۔ چیختا رہا۔ غراتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے ایک بند کمرے نما ہال میں پہنچا دیا گیا وہاں ابو بھی تھے۔ چاچا بھی تھے۔ اس کے بھائی بھی تھے۔ ابو اور چاچا خون رنگ زخمی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دھول' مٹی' ریت' غصہ' دکھ' ملال' غم۔

جانے ان سب کو کیا ہوا تھا۔ وہ تو چینج کرنے کی غرض سے پنڈال کی رونق سے باہر نکلا تھا۔ قاسم اور عاصم اسے گاڑی میں بیٹھا کر اس عمارت میں لے آئے تھے اور وہ دونوں بھی غم و غصے سے بے حال تھے۔

وہ عمارت کی پچھلی طرف سے انٹر ہوئے تھے۔ عون گھبراہٹ' غصے' اشتعال میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ عمارت کس چیز کی تھی؟

اور اب اس ہال نما کمرے میں چند اجنبی چہرے بھی دکھائی دیے تھے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کچھ انہونا ہونے والا ہے؟ آخر کیا ہونے والا تھا؟ عون کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد عون پہ ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر ابو نے کسی باریش آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مولوی صاحب! بسم اللہ کیجیے۔"

ابو کی آواز میں دکھ تھا۔ شکستگی تھی' غصہ تھا اور سب سے بڑھ کر عون کے لیے شدید نفرت تھی۔ عون کا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابو کا اشارہ پاتے ہی مولوی نے خطبہ

بلند آواز میں پڑھا تھا۔ پھر کچھ رسمی کاروائی ہوئی تھی۔ رجسٹر پہ دستخط لیے گئے تھے۔ یہ کوئی ایجاب و قبول کی رسم تھی؟ یہ کسی کے نکاح کی رسم تھی؟ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کس لیے تھا؟

عون نے ابو کی زہر بھری گھوریوں سے خائف ہو کر غائب دماغی سے سائن کر دیے تھے۔ پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے ابو اور چاچا کو گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

یہ مبارک کس سلسلے کی کڑی تھی؟ یہ نکاح کس کا تھا؟ عون کا دماغ بند ہونے لگا۔ شعور کھونے لگا۔ عقل گم گئی۔ فہم مر گیا۔

اسے کچھ دیر بعد اسی سوٹڈ بوٹڈ آدمی نے گلے لگایا تھا۔ وہ آدمی کون تھا؟ وہ عون سے کیوں مل رہا تھا؟ بہت دیر بعد اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ بہت دیر بعد اس کی عقل نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ بہت دیر بعد عون عباس کو پتا چلا تھا کہ یہ نکاح کی کاروائی ہو رہی تھی۔ اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ فریحہ سے نہیں' ماہ رو سرفراز سے اور یہ عمارت کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک نامور ہسپتال کی بلڈنگ تھی۔

اور جب تک اس کی عقل' شعور اور فہم نے کام کرنا شروع کیا تھا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔۔۔ اتنی دیر کہ عون عباس منجمند ہو کر پتھر کا بت بن گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہ رو کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا تھا۔

اس وقت وہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر تھی۔ اگر لمحہ بھر کی تاخیر کے بعد اسے ہسپتال لایا جاتا تو تب تک ماہ رو کو برین ہیمبرج بھی ہو سکتا تھا۔

یہ تو ماہم تھی جو نوکروں کی مدد سے بروقت ماہ رو کو ہسپتال لے آئی تھی۔ انتہائی ذمہ دار ڈاکٹرز کی فوری ٹریٹمنٹ نے ماہ رو کو کسی بھی انتہائی تکلیف سے بچا لیا تھا۔

اسے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد ایک قیامت سرفراز احمد کی منتظر تھی۔ وہ عالم غشی میں بھی "عباس عباس" پکارتی رہی تھی۔ وہ ہوش میں آ کر بھی چیخ چیخ کر روتی رہی تھی۔

"عباس! تم کہاں ہوں۔ تم رکتے کیوں نہیں؟ میں تمہارے پیچھے بھاگ بھاگ کر مر جاؤں گی۔ عباس! رک جاؤ۔ عباس! لوٹ آؤ۔۔۔ دیکھو میں بری نہیں۔۔۔ میں بری نہیں۔" وہ پچھلے ایک گھنٹے سے چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ سرفراز احمد کے دل پہ جیسے قیامت بیت گئی تھی۔ وہ تڑپتی ماہ رو کو سینے سے لگا کر رو پڑے تھے۔

ابھی اس کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر واحدی نے بھی سرفراز احمد سے عباس کے متعلق پوچھا تھا۔ سرفراز احمد خود انجان تھے۔ بھلا کیا بتاتے؟ ان سے اکلوتی بیٹی کا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ صدمے سے ان کا دل پھٹ رہا تھا۔ وہ خود زندگی میں پہلی مرتبہ ماہ رو کو اس طرح تڑپتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی جیسے جان نکل رہی تھی۔ یہ کون تھا جس نے ان کی شہزادی کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ وہ زمین کے اوپر تھی' زندہ تھی لیکن چند ہی گھنٹوں میں ژولیدہ حال ہو چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر خود بھی شاکڈ رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر واحد نے تنہائی میں انہیں بہت کچھ بتایا تھا۔ "آپ کی بیٹی عباس نامی کسی

جوان سے اٹیچ منٹ رکھتی ہے۔ یہ کوئی شدید صدمہ یا ٹارچر کیے جانے کا اثر ہے۔ آپ ماہ رو کو اعتماد میں لے کر اس مسئلے کا حل کریں۔" ڈاکٹر واحدی کے بتانے پر وہ نظر چرا گئے تھے۔ اور اس وقت ماہ رو کا تڑپ تڑپ کر رونا سرفراز احمد کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ وہ ان کے کندھے سے سر پٹخ رہی تھی۔ اس حال میں کہ ماہ رو کے آنسوؤں سے ان کا شانہ تر ہو چکا تھا۔

"ڈیڈی! بتائیں مجھے' میں بری لڑکی ہوں؟ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں؟ اگر میں بری لڑکی ہوں تو آپ نے مجھے اچھا کیوں نہیں بنایا؟ ڈیڈی وہ کہتا ہے میں بری ہوں.... ڈیڈی! اسے جا کر بتائیں میں بری نہیں ہوں۔ میں گندی نہیں ہوں۔ اگر میں بری ہوں تو اس کے لیے اچھی بن جاؤں گی۔ ڈیڈی! میں اچھی ہو جاؤں گی۔ پلیز' عباس کو لادیں۔ عباس کو واپس لادیں۔" ماہ رو چیخ چیخ کر ایک مرتبہ پھر خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ یوں کہ سرفراز احمد بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔ انہیں کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آگیا تھا۔ انہیں ماہ رو کی حالت زار کا سبب سمجھ میں آگیا تھا۔ ماہ رو اس قدر آگے تک پہنچ گئی تھی اور انہیں خبر ہی نہیں ہو سکی۔ وہ کیسے باپ تھے؟ انہیں علم نہیں ہو سکا' اور ان کی بیٹی اتنے بڑے بڑے کربناک فیز سے گزر گئی۔ ان کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔ پچھتاوا کم نہیں ہو رہا تھا۔

ماہ رو کی حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے ماہم کو بلالیا تھا۔ تب شازمہ بھی موجود تھی۔ ماہم نے شازمہ کی موجودگی میں کچھ کھل کر نہیں بتایا تھا۔ پھر بھی اس کی ڈھکی چھپی باتوں کو سرفراز احمد سمجھ گئے تھے۔ ان کی بیٹی ان حالوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ کیسی کیسی اذیتوں سے گزر گئی تھی۔ انہیں ملال گھیرے ہوئے تھا۔ انہیں پچھتاوے گھیرے ہوئے تھے۔ ماہ رو کا اقرار محبت انکشافات کا مرحلہ بھی تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' ماہ رو کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ کوئی کمی رہ گئی تھی۔ ورنہ یوں تو نہ ہوتا۔ آج انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کی اپنی ماں ہوتی تو شاید ایسی صورت حال میں اسے نفسیاتی اور جذباتی سہارا دیتی۔ اس کا دکھ بٹاتی۔ اسے سمجھاتی اس تکلیف میں اسے اکیلے پن کا احساس نہ ہونے دیتی۔

شازمہ سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ ماہ رو کا آزار کم کرتی؟ شاید کبھی نہیں۔

سرفراز احمد شدید پریشان تھے۔ اور اتنا انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ماہ رو سمجھنے سمجھانے والے فیز سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ عباس سے محبت میں بہت آگے تک جا چکی تھی۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

پھر انہیں اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے کوئی سدباب تو کرنا ہی تھا۔ وہ کوئی مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے باپ تو نہیں تھے۔ اتنی سی بات پر بیٹی کو معتوب ٹھہرا دیتے.... وہ تو اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے آخری حد تک بھی جا سکتے تھے۔ انہیں ماہ رو کی خوشی ڈھونڈنی تھی۔ انہیں عباس تک پہنچنا تھا۔ عون عباس تک جانا تھا اور یہ سرفراز احمد کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

لیکن ہوا کچھ اس طرح سے۔

سرفراز احمد ابھی اپنے ذرائع الرٹ کر ہی رہے تھے جب شازمہ نے وہ کام کر دکھایا' جو ان کے گمان میں خاصا کٹھن اور مشکل ترین تھے۔

وہ جو سوچ رہے تھے کہ انہیں خود اپنی بیٹی کا پرپوزل لے کر رحمان اور فرقان صاحب کے پاس جانا ہو گا.... شاید ان کی منت بھی کرنا پڑے۔ شاید انہیں مجبور بھی کرنا پڑے۔ شاید بیٹی کا باپ ہو کر التجا بھی کرنا پڑے۔ سرفراز احمد اس وقت دم بخود رہ گئے تھے جب خود بخود عون عباس کا باپ' اس کا چاچا اور اس کے بھائی شرمندہ حالت میں' انتہائی شرمسار' افسردہ' رنجیدہ اور سر جھکائے سرفراز احمد سے معافی مانگنے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف سرفراز احمد سے معافی مانگی تھی بلکہ بڑی عاجزی کے عالم میں سر جھکا کر اپنے بیٹے کی غلطی اور گناہ تسلیم کرتے ہوئے ماہ رو کا رشتہ طلب کیا اور فوری نکاح پہ اصرار بھی کیا۔

یہ سب انتہائی اچانک رد عمل کے طور پر ہوا تھا۔

کیا عباس نے خود رشتہ بھیج دیا تھا۔ جب اسے ماہ رو کی تکلیف اور ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا پتا چلا؟
سرفراز احمد نے کسی بھی بات پہ غور نہیں کیا تھا ان کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جس خوشی کو وہ خود عون عباس کے گھر سے ڈھونڈ کر لاتے وہ خود بخود چل کر ان کی دہلیز پر آ گئی تھی۔ یہ ان کی خوش نصیبی نہیں تو کیا تھا؟
یوں عون کے والد اور چاچا کے اصرار پہ فوری طور پر ہسپتال میں ہی نکاح کی کاروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ رخصتی کے لیے اگلا دن مقرر ہو گیا۔ سرفراز احمد کو ماہ رو کی خرابی طبیعت کی وجہ سے اعتراض تو تھا ہی مگر شازمہ کے حامی بھر لینے کے بعد وہ خاموش ہو گئے تھے۔
یوں ماہ رو اگلے ہی دن بیاہ کر، پور پور سجا کر عون عباس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کسی سہانے خواب کی مانند اتر آئی تھی۔ ایسا خواب جو ایک ہی چھناکے میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس بھیانک انداز میں کہ ماہ رو کراہ بھی نہیں سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نکاح کے بعد فوری رد عمل کے طور پر اس کا اپنے ہی گھر والوں پہ پھٹ پڑنا فطرت کا عین تقاضا تھا۔
جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اور جو کچھ کیا گیا تھا وہ کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا۔
پہلے تو اسے نکاح کے دو گھنٹے بعد بھی یقین نہیں آیا تھا کہ ماہ رو سرفراز اس گھر میں، اس کی خواب گاہ میں ہمیشہ کے لیے آ گئی تھی۔ وہی ماہ رو، جس سے عون عباس کو شدید قسم کی نفرت ہو گئی تھی۔ اسی ماہ رو سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑوانے کی خاطر وہ کسی بد نصیب گھڑی میں اس کے گھر چلا گیا تھا۔ محض اسے آئینہ دکھانے۔ صرف اسے ذلیل کرنے اور بتانے کہ کم از کم آئندہ زندگی میں وہ اسے تنگ نہ کرے۔ وہ تو ماہ رو کے باپ کو اس کے کرتوت بتانے آیا تھا۔ مگر خود بری طرح سے پھنس گیا تھا۔
اور اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ یہ گیم کس نے کھیلی تھی؟ یہ چال کس نے چلی تھی؟ وہ بھی اسی انداز میں کہ عون کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے ملامت تھی۔ ہر آنکھ میں اس کے لیے غصہ تھا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار بن چکا تھا۔ ان سب نے عون کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا اور خود ہی سزا بھی سنا دی تھی۔
آج اپنے ہی گھر میں داخل ہوتے ہوئے عون کو اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ایسے لگتا، ہر آنکھ اسی کے تعاقب میں ہے۔ جیسے اس نے بہت بڑا گناہ کر لیا تھا۔ جیسے اس نے بہت بڑا جرم کر دیا تھا۔
حالانکہ فریحہ سے اس کی شادی کو روکنے والے بھی اس کے گھر والے تھے۔ ماہ رو کو یہاں اس گھر میں لانے والے بھی یہی گھر والے تھے پھر ان کی ناراضی، غصہ، نفرت کا مطلب کیا تھا؟
وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا۔ لیکن اسے نہ الجھنے کا اتنا وقت ملا تھا اور نہ سوچنے کا اتنا وقت ملا تھا۔ اس لیے کہ نکاح کے فوراً" بعد عون پہ بڑے بھیانک انکشافات ہوئے تھے۔
وہ سب کی نفرت غصے اور ملامت کی وجہ جان گیا تھا۔ وہ اپنے والدین کو حق پہ سمجھتے ہوئے ہر الزام سے بری کر چکا تھا۔
انہوں نے جو کیا تھا ٹھیک ہی کیا تھا۔ انہوں نے جو سنا تھا جیسا سنا تھا اسی پہ عمل کرنا تھا۔ اسی کو سچ ماننا تھا۔ اس کے غیرت مند ماں باپ کی طرح کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا اسے یہی کرنا تھا۔ ازالے کے طور پر وہ لوگ یہی کر سکتے تھے۔ اپنی عزت، ناموس اور وقار کو بچانے کے لیے اپنے تئیں عون کے ماں باپ نے بڑا بروقت فیصلہ کیا تھا۔
مگر چالبازوں کو تو ان کی سزا ملنی چاہیے نا؟
نکاح کے فوراً" بعد جب وہ کسی بپھرے طوفان کی طرح ہال کمرے میں موجود اپنے والدین اور بھائیوں پہ گرج رہا تھا۔
"آپ نے کچھ دیر پہلے جو میرے ساتھ کیا ہے۔

میں پوچھ سکتا ہوں؟ یہ سب کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ آپ نے میری زندگی کو کیوں تماشا بنایا؟" وہ نفرت اور آگ کا طوفان بنا ہوا تھا۔ وہ اس پوری رات لڑتا اور جھگڑتا رہا تھا۔ وہ اگلے دن تک بھی چیختا رہا.... غصہ کرتا رہا.... زہر اگلتا رہا۔

"یہ اس عورت کا منصوبہ ہے۔ اس نے مجھے چیٹ کیا۔ میں اسے کبھی کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔" وہ کف اڑاتا اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔

"آپ سب اس عورت کے ساتھ مل گئے تھے۔ کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟" عون شدت ضبط سے پھٹ پڑا تھا۔" اور یہ اس کے والدین تھے۔ جو اس پہ ذرا بھی بھروسہ نہیں کرسکے تھے۔ بلکہ اس چالباز عورت کی چال میں آگئے تھے۔ کیا انہیں عون پہ اعتبار نہیں تھا؟

اور جب عون نے بھرے مجمع میں اپنے باپ سے سوال کرلیا تو انہوں نے ذرا بھی اس کے وقار کی لاج نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے اسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ پہ طمانچہ مار دیا تھا۔

"تماشا تو تم نے ہمارا بنادیا ہے۔ شادی والے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ تمہاری چاچی ہسپتال میں پڑی ہے۔ مہمان انگشت بدندان ہیں۔ ہر آنکھ میں تجسس ہے، غصہ ہے، دلچسپی ہے۔ ہر زبان پہ قصے کہانیاں ہیں۔ جاؤ باہر نکل کر دیکھو اور زبان چلانے والوں کی زبانیں کاٹ آؤ۔ ہر کوئی تمہیں گناہ گار تسلیم کررہا ہے۔ آخر کچھ تو تھا نا۔ جو بات یہاں تک اس نوبت تک آئی۔

پچھلے کچھ عرصے سے میں بھی تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی اپنی تربیت پہ ناز بہت تھا۔ جو اڑتے اڑتے قصے میرے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ جھوٹے ہیں، بے بنیاد ہیں۔

ارے کوئی عزت دار شریف ماں باپ کی اولاد اتنا جھکتی نہیں۔ التجائیں نہیں کرتی اور وہ شریف آدمی کس قدر بے بس تھا۔ اور وہ عورت جس کی بیٹی کو اس کے گھر جاکر تم نے برباد کیا ہے اس عورت کا کیا قصور تھا جو روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔ آخر کچھ تو تم نے ان لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی بیٹی کو کس انتہا تک پہنچا آئے کہ وہ ہسپتال میں زندگی موت کی کشمکش میں جاپڑی۔

تم پر قہر ٹوٹ پڑے۔ ذرا غیرت نہ آئی۔ ایک دن بعد تمہاری شادی کے شادیانے بجنے تھے اور تم نے اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر میرے سر میں خاک ڈلوادی۔ میری عزت کو دھجی دھجی بکھیر دیا۔ مجھے ذلیل و خوار کردیا۔ ساری دنیا کے سامنے سب سے بڑی بات میرے اکلوتے بھائی کے سامنے، اس کی اکلوتی بیٹی کے سامنے۔

آہ تھو، نفرت ہے مجھے تم سے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کردیتا۔ تمہیں گھر بدر کردیتا۔ اپنے وجود اور کاروبار سے الگ کر دیتا۔

لیکن اس تمہاری ماں کی وجہ سے بے بس ہوں۔ یہ عورت مجھے کسی بھی انتہائی فیصلے تک نہ جانے دیتی۔ میں بے بس ہوں اور تمہیں اس گھر میں رکھنے پہ مجبور ہوں۔

اس لیے کہ جس عزت دار، شریف آدمی کی بیٹی کے سر پہ چادر ڈال کر ایک دعوے کے تحت یہاں لایا ہوں۔ اب اس عہد سے پھر نہیں سکتا۔ اس عہد کو زندگی بھر نبھاؤں گا۔ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر لایا ہوں اور تمہارے حصے کے گناہوں کی معافی مانگ کر آیا ہوں۔ اس لیے کہ میرے اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کسی شریف آدمی کی بیٹی کو اپنی اولاد کے ہاتھوں برباد ہوتے اور اجڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔" ابو کا جاہ و جلال اور غصہ بحر ہند میں کسی طوفان سے کم نہیں تھا۔ اور عون تو ایسے بدک کر پیچھے ہٹا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

یہاں تو الزام در الزام کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ نہ کوئی اس سے وضاحت لے رہا تھا۔ نہ کوئی بات سن رہا تھا۔ نہ کسی کو عون کی وضاحتوں میں دلچسپی تھی۔ وہ اپنی صفائی کس کے سامنے پیش کرتا۔

اس کا پورا گھرانہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ اور ابو تو صفائی میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر رہے تھے۔ عون کو لگا تھا اس کے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ کوئی نس تو ضرور پھٹ جائے گی۔ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اس قدر بے اعتباری؟ اس قدر بد اعتمادی؟ صرف ایک دو ٹکے کی بے حیا عورت کی وجہ سے۔ جس نے رو دھو کر جانے کون سا ڈرامہ رچا کر اس کے والدین کو اپنے ہی بیٹے سے متنفر کر دیا تھا۔

عون کا دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔ اس ماہ رو نامی خون آشام بلا کو آگ لگا دے۔

"اور صد شکر کہ میری بیٹی فریحہ کی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ بروقت تمہارے کرتوت ہمارے سامنے آ گئے۔ بہت جلد تمہارا گھناؤنا روپ کھل گیا۔ اگر یہ سب بعد میں پتا چلتا تو کیا ہوتا۔ کس قدر برا ہوتا۔۔۔ اور تم نے اس بچی کو برباد کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اسی کیے ازالے کے طور پر، تمہاری سزا بنا کر اسے یہاں لایا ہوں۔۔۔" ابو ٹھونک بجا کر اعلان کر رہے تھے۔ بہت ساری آنکھوں میں ابو کے اس نیک عمل پہ ستائش بھری ہو گی۔ وہ اپنی عزت اچھالنے کی بجائے بڑی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں بیٹے کے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اس ستم زدہ لڑکی کو بہو بنا کر گھر لے آئے تھے۔

یہ ان کی دور اندیشی اور دانش مندی ہی تو تھی۔

"برباد تو مجھے کیا ہے اس نے۔ میرے ہی گھر والوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے۔ میں اس سے انتقام لوں گا اور ضرور ہی لوں گا۔" غصے کی انتہا پہ عون کے اشتعال کا رخ کسی اور سمت نکل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے خون بھر گیا تھا۔ ابو اس کے ارادے جان کر گرج دار لہجے میں پورے قد سے کھڑے ہو کر غرائے تھے۔

"خبردار، جو تم نے اس بچی کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے میرا مزید تماشا لگوایا۔ خبردار، جو تم نے مزید میری عزت کا جنازہ نکلوایا۔۔۔ میں اس کے باپ کے ساتھ عہد باندھ کے آیا ہوں۔ مجھے اور ذلیل کیا تو کھڑے کھڑے گولی سے اڑا دوں گا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اپنے اونچے پورے بیٹے کا گریبان چاک کر ڈالیں۔ ان قدموں کو کاٹ ڈالیں جن سے چل کر وہ سرفراز احمد کے گھر کی دہلیز پار کر کے گیا تھا۔

وہ باپ کے فیصلہ کن گرج دار لہجے اور بھیانک دھمکیوں پہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"ابو! آپ میرا یقین کریں۔ میں نے کچھ برا نہیں کیا۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔۔۔ یہ سب جھوٹ ہے سازش ہے۔ میرے خلاف منصوبہ بنایا گیا ہے۔ میں تو فریحہ کے ساتھ شادی پہ خوش تھا۔ میں تو فریحہ۔۔۔" عون نے شدت ضبط کے ساتھ آنکھیں دباتے بمشکل اپنے الفاظ منہ سے ادا کیے تھے۔ ابو نے اسے نفرت انگیز لہجے میں بے ساختہ روک دیا تھا۔ انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"میری بیٹی فریحہ کا اپنی گندی زبان سے نام بھی مت لو۔ سنا تم نے، آئندہ میں تمہارے منہ سے فریحہ کا ذکر بھی نہ سنوں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔ جس نے میری بے بسی کو سمجھا میرا ساتھ دیا۔ ہر قدم پہ میرے ساتھ رہا۔ تمہارے عیب دھونے بھی میرے ساتھ گیا۔ اس آدمی سے معافی مانگی۔ میں تو عمر بھر اپنے بھائی کا احسان مند رہوں گا۔" ابو گرجتے گرجتے آخر میں آبدیدہ ہو گئے تھے۔ پھر دوبارہ سے فارم میں آ گئے۔

اس کی امی جو چپکے چپکے رو رہی تھیں ایک دم عون کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"بس بھی کریں، بہت ہو گیا۔ اپنی جذباتیت اور غصے کا پتا نہیں میرے بیٹے کی جان کا وبال بن گئے ہیں۔ اس کی غلطی کیا ہے؟ جرم کیا ہے؟ میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی کی ضرور چال ہو گی۔" امی جو اتنے گھنٹوں سے خاموش تھیں۔ اچانک اس کے سامنے ڈھال بن گئی تھیں۔ امی کے اٹھتے ہی عاصم اور قاسم بھی کچھ جز بز سے ہوئے۔ شاید وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ اس یوم حساب کا خاتمہ ہو۔ عدالت برخاست کی جائے۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا تھا۔ جو ذلت اٹھانا پڑی تھی۔ وہ اٹھالی

تھی۔ اب باقی کیا بچتا تھا؟ ادھر عاشر بھی بے قرار سا کھڑا ہو گیا۔

"ابو! آپ عون کو ایک موقع ضرور دیں۔ آپ اس کی بات تو سن لیں۔ کیا پتا' واقعی ہی کوئی سازش ہو۔ ہمارا عون ایسا تو نہیں۔ کیا آپ اپنی تربیت کو بھول گئے ہیں؟"

عاشر کے نرم انداز پہ ابو بھی کچھ نرم ضرور پڑے تھے تاہم یہ نرمی عون کے لیے ہرگز نہیں تھی۔ یہ نرمی صرف اور صرف اس شریف آدمی کی بیٹی کے لیے تھی جسے عون نے برباد کیا تھا۔ اور جس کے باپ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگی تھی۔

"میری بیٹی بہت نادان ہے۔ ناسمجھ ہے۔ اس کی غلطیوں پہ درگزر کیجیے گا۔ اسے آپ سب کے پیار کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی نے پیار کے معاملے میں بہت محرومی دیکھی ہے۔" وہ بار بار بھیگی آواز میں اپنی بیٹی کے لیے خوشیوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اور آخری دم تک اپنی بیٹی کی نادانی' کم فہمی' جذباتیت اور کچھ کچھ خود سری کی بات بھی کرتے رہے تھے۔ اس وقت عون کے ابو کو عون پہ بہت غصہ تھا۔ وہ کسی بھی بات کو سن نہیں سکتے تھے تاہم ماہ رو کو خوش رکھنے کا عہد ضرور دے کر آئے تھے۔ اور اب اس عہد کو زبردستی نبھا کر دم لینے والے تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

انہوں نے بیانگ دہل اعلان کر دیا تھا۔ کوئی بھی ماہ رو کو اس گھر میں تکلیف دینے کی کوشش نہیں کرے گا اور جسے وہ سنا رہے تھے وہ پیروں کی ٹھوکروں سے ایک ایک چیز اڑاتا' ہذیان بکتا نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہم نے کھڑکی سے پردے سمیٹ کر اے سی کی کولنگ کو کم کیا۔ پھر وہ بیڈ پہ آڑھی ترچھی لیٹی ماہ رو کو زبردستی اٹھا کر غرائی تھی۔

"اٹھ جاؤ ماہ رو! وہ لوگ آبھی چکے۔ اور ابھی تمہارا اشنان بھی باقی ہے۔" اسے ہسپتال سے آئے سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے جب حواس باختہ سی ماہم اس کے روم میں بھاگی بھاگی چلی آئی تھی۔ اس کا چہرہ جوش کے عالم میں سرخ تھا۔ حواس باختہ تھے' آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رنگت گلابی تھی۔

اس نے نیند میں دھت سوئی ماہ رو کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ماہ رو دوبارہ تکیے میں گم ہو گئی تھی۔ ماہم اسے جگا جگا کر تھک چکی تب اسے ٹھنڈے پانی کا خیال آیا تھا۔ وہ کیسے اپنا پرانا حربہ بھول گئی تھی؟ ماہ رو کے پیروں پہ پانی ڈالتے ہی اس کی نیند کو بھگا دینے کا قدرتی ٹوٹکا تھا۔

پیر گیلے ہوتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی جیسے اس وقت اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ نیند میں گم.... مندی مندی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی۔

ماہم نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

"ماہ رو! اٹھ جاؤ' وہ لوگ آبھی چکے۔ تم نے تیار بھی ہونا ہے۔ یہ نہ ہو تمہیں چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔" ماہم نے اسے دھمکایا تھا۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر تکیے پہ سر گرا کر بے انتہا ہنسنے لگی تھی۔ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ اس کی ہنسی کے گھنگھرو پورے روم کی فضا کو کھنکھنانے پہ مجبور کر رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا وہ اتنے گھنٹوں کی گھٹن' حبس اور غبار کو ہنسی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے باہر نکال دینا چاہتی ہے.... اپنے من کو شانت کر لینا چاہتی ہے۔ آخر دل کی مراد جو بر آئی تھی۔

ماہم نے زبردستی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کی کوشش کی تھی۔

"باقی اپنی سسرال جا کر ہنسی کے سر بکھیر لینا۔ ابھی فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔" ماہم نے اسے کھینچ کر بیڈ سے اتارا تھا۔ تب وہ لمبی سی انگڑائی لے کر ہنستی ہوئے بڑے دلفریب لہجے میں بولی تھی۔

"پہلے مجھے یقین دلا دو ماہم! کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میری زندگی میں کیا کیا نہیں ہو چکا؟ میری ذات بدل گئی' نام بدل گیا'

زیست بدل گئی اور میں خود بھی بدل گئی۔ مجھے یقین کیوں نہیں آرہا ماہم! کہ خوابوں کی تعبیریں یوں بھی مل جاتی ہیں؟ محبتیں یوں مل جاتی ہیں عشق تکمیل کے مراحل تک بھی پہنچتا ہے؟ محبت کو وصل کی شب بھی نصیب ہوتی ہے؟

"مجھے یقین نہیں آرہا ماہم! بالکل نہیں آرہا... چوبیس گھنٹے پہلے ایک قیامت میری ہستی کو ہلا گئی تھی۔ وہ قیامت جسے میں دوبارہ سوچنا بھی نہیں چاہتی... وہ لمحے جنہیں میں ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتی ہوں۔ وہ اذیت جو اسی وقت اپنا اثر کھو گئی تھی جب میرے نام کے ساتھ عباس کا نام جڑ گیا تھا۔ لیکن ماہم! مجھے یقین کیوں نہیں آرہا؟ یہ ممکن کیسے ہوا؟ عباس جیسا آتش فشاں 'گل و گلزار' کیسے بنا؟ اس نے اقرار کس طرح سے کیا؟ ہمارا نکاح کیسے ہوا؟ وہ کس طرح سے مان گیا؟ محض چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر سب کچھ میری چاہت 'خواہش اور تمنا کے مطابق کس طرح سے ہوا یہ...؟" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بڑی گہری باتیں کر رہی تھیں۔ کیونکہ جب سے نکاح ہوا تھا تب سے اس کا ذہن ان سوالوں کی یلغار میں خاصا گھٹ رہا تھا۔ وہ ماہم کے ساتھ سب کچھ شیئر کر کے خود کو پرسکون کرنا چاہتی تھی۔

"بی بی! تم آم کھاؤ... اب پیڑ کیوں گنتی ہو۔" ماہم کا انداز مزاحیہ قسم کا تھا۔ وہ اس کا گال کھینچتے ہوئے بولی تھی۔

"عباس پہ کیوپڈ کا تیر چل گیا ہو گا' اس وقت شرارے تو اگل گیا تھا۔ بعد میں جا کر احساس ہو گیا ہو گا۔ وہ کیوں ماہ رو کا دل توڑ آیا۔" ماہم نے مسکرا کر اس کے وہم دور کرنا چاہے تھے۔

"رئیلی؟" اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ ماہم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر یوں ہوا کہ اسی رات بارہ بجے تک وہ اپنے ابا' چاچا اور بھائیوں کے ساتھ دوبارہ تمہارا دل جوڑنے ہسپتال پہنچ گیا۔" دل جوڑنے سے مراد نکاح تھا۔ ماہم اپنے انداز میں ہی گفتگو کرتی تھی اور بہت اچھی گفتگو کرتی تھی۔

"اس کے گھر والے اتنا اچانک مان گئے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔" اس نے بے تابی سے کہا تھا۔ تب ماہم نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"او... سلی گرل! مان گئے تھے تبھی کل نکاح کر گئے اور آج وہ سب نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ تمہیں رخصت کروانے آئے ہیں۔" ماہم نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ ماہ رو کا دل جیسے دھک دھک کرنے لگا۔ دل کی لے کچھ بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بار حیا سے جھک گئیں۔ دھڑکنوں میں غضب کا تلاطم برپا ہو گیا تھا۔ ماہم اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہوتی مسکرا کر بولی۔

"میں تو چاہتی تھی تمہاری شادی دھوم دھام سے ہو۔ مگر وہ لوگ سادگی پہ زور دے رہے تھے۔ پھر شازمہ آنٹی نے بھی کہا۔ جیسے وہ لوگ مناسب سمجھیں۔"

"ممی نے؟" ماہ رو کچھ چونک گئی تھی۔

"ہوں۔" ماہم نے بتایا۔ بلکہ مزید بھی بتایا۔

"نو ڈاؤٹ' ان دنوں میں شازمہ آنٹی نے تمہاری رئیل مدر جیسا رول پلے کیا ہے۔ اللہ ان کی ایبلٹی بڑھائے۔ اس تمام سیٹ اپ کو جو اس قدر اپ سیٹ ہو چکا تھا۔ اسے اپنے پوائنٹ آف وے یا میتھڈ سے شازمہ آنٹی نے اپنی فل سٹرینتھ اور' ایبلٹی اور انرجی کے ساتھ ہینڈل کیا۔" ماہم کے لہجے میں ستائش بھری تھی۔ اور وہ پہلی مرتبہ شازمہ کی تعریف کر رہی تھی۔

"اس نکاح کے بعد آج رخصتی میں ہر قسم کی فنڈنگ پلاننگ شازمہ آنٹی کی تھی۔ اور ان کے پریکٹیکل نالج کی وجہ سے آج یہ خوب صورت وقت تمہارا نصیب بنا ہے۔ اور تم ہمیشہ کے لیے عباس کی ہونے جا رہی ہو۔" ماہم نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔ ماہ رو کا تحیر بڑھتا چلا گیا۔ بڑھتا چلا گیا۔

"گو کہ یقین نہیں آتا... بٹ مان لیتی ہوں۔" وہ

شرارتاً" مسکرائی تھی۔۔۔ "اب سارا کریڈٹ ممی کو دینا پڑے گا۔ محبت میں ہماری خواری تو بھاڑ میں گئی۔"

"تم جا کر اسے پوری حکایت سنا دینا۔" ماہم نے مشورہ دیا تھا۔ پھر اسے واش روم کی طرف دھکیلا۔

"ہری اپ، ابھی بیوٹیشن پہنچ جائے گی۔ یہ بھی کریڈٹ تمہاری ممی کو جاتا ہے۔ صبح سویرے برائیڈل ڈریس، جیولری، شوز اور تمہاری کافی شاپنگ کر لائی ہیں۔ وہ لوگ تو سادگی سے ہی چاہتے تھے پھر بھی آنٹی نے کافی اہتمام کر لیا۔" ماہم ممی سے کچھ زیادہ ہی متاثر لگ رہی تھی۔

پھر جب ماہ رو فریش ہو کر نہا کے باہر نکلی تب تک بیوٹیشن بھی پہنچ گئی تھی۔ مزید اسے ماہم سے کوئی بھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حالانکہ وہ عباس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

پھر جب بیوٹیشن اس کے حسن کو چار چاند لگا کر چلی گی اور ماہم اس کے حسن، خوب صورتی اور روپ کے جلووں کو دیکھ کر مصنوعی بے ہوش ہو گئی تھی تب ماہ رو نے اس کا بازو دبوچتے ہوئے زوردار قسم کی چٹکی کاٹ کر کہا۔ کیونکہ یہ کلبلاتا سوال اس کی جان لینے کے درپے تھا۔ ماہم نے سب کچھ بتایا تھا لیکن عباس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہ ایکٹنگ چھوڑو، مجھے اتنا بتاؤ۔۔۔ عباس کیسا لگ رہا ہے؟" ماہ رو کے اس سوال پہ ماہم کی بے ہوشی خود بخود ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اٹھی۔

پھر اس نے بڑی حیران آنکھوں سے دیکھتی ماہ رو کی حسین آنکھوں میں اور بھی حیرانگی بھر دی تھی۔

"عباس تو نہیں آیا۔ اس کی امی، ابو، بھائی اور ایک بھابھی ضرور ہیں۔" اور ابھی ماہم مزید عباس کے نہ آنے پہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے روشنی ڈالنا چاہتی تھی جب اچانک دروازہ کھلا تھا اور ڈیڈی، شازمہ، عون کی امی اندر داخل ہو گئے تھے۔ تب سارے سوال، جواب، جواز اور وہم بھول کر ماہ رو ڈیڈی کی کھلی بانہوں میں سما گئی تھی۔

وہ آج اپنے ڈیڈی سے رخصت ہو رہی تھی گو کہ ڈیڈی نے اس کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا۔ بہت کم اپنی محبت سے نوازا تھا پھر بھی اس نازک گھڑی میں اس کا دل بھر بھر آیا۔

اس کے آنسو آنکھوں سے اتنی خاموشی سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ عون کی بھابھی نے اسے چادر اوڑھادی تھی۔

پھر وہ ڈیڈی کے بازوؤں کی زنجیر میں سر ٹکا کر روتی رہی۔ اور ڈیڈی کا ہاتھ اس کے سر پہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

ڈیڈی نے ماہ رو کی پیشانی چومی تھی۔ تو یوں لگا، تپتے صحرا میں ٹھنڈی میٹھی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔

اور جب وہ اپنے عالیشان بنگلے کی سیڑھی سے۔ جو دبیز ایرانی قالین سے مزین تھی۔ سہج سہج اتر رہی تھی۔ تو اسے اندازا نہیں تھا۔ وہ کہاں اتر رہی ہے؟ وہ بلندی سے پستی میں اتر رہی ہے۔ وہ آسمان سے پاتال کی طرف آ رہی ہے۔ اور لاؤنج سے گزرتے ہوئے اسے اچانک عون عباس کے نقش پا کا خیال آ گیا تھا۔

اسی فرش پہ عون کے پیروں کی دھمک پڑی تھی جس نے ماہ رو کے دل کی دھرتی کو ہلا دیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے وہ اسے دھتکار گیا تھا۔ وہ اسے دھتکارتا آ رہا تھا۔ اور گلاب کی نم شفاف ملائم اور حسین پتیوں پہ چلتے ہوئے ماہ رو سرفراز کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نرم پتیاں نہیں، آبلہ پائی کے سفر کا ایک ٹریلر تھا۔

کیونکہ ماہ رو سرفراز کے راہ گزر کی مسافتوں کا ابھی اختتام نہیں ہوا تھا۔ ابھی یک طرفہ محبت کا یہ سفر تمام نہیں ہوا تھا۔

مجھے منزلوں سے عزیز تر ہیں تیری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں
اسی ایک پل کی تلاش میں، جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری راہ گزر میں بکھر گئیں، میری عمر بھر کی مسافتیں

یہ اماوس کی گہری اور کالی رات تھی۔ کسی بھی ذی شعور کو خوف اور بھیانک خوف میں مبتلا کرنے والی۔ گہری' کالی اور سیاہ رات۔۔۔۔ جس کی پیشانی پہ کوئی ایک جگنو یا ستارہ نہیں چمکتا تھا۔ اسے پتا تو تھا' اماوس کالی اور خوف ناک بھی ہوتی ہے اور اماوس سیاہ نصیب بھی ہوتی ہے۔ اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اماوس بدنصیبوں کی زندگی میں "کالی رات" بن کر اترتی ہے شب برات بن کر نہیں اترتی۔ اور وہ جانتی تھی کہ اماوس مسطر سے جس کی زندگی کے گرد سیاہ حاشیہ لگا دیتے پھر کبھی کوئی بدنصیب ان کے حصار سے نکل نہیں پاتا تھا۔ اس کی زندگی پھر اماوس کے دائرے میں ہمیشہ رہتی۔ نہ بڑھتی نہ گھٹتی بس عمر بھر کے لیے ٹھہر جاتی۔ دراصل اماوس فریحہ کی طرح محبت کے ماروں اور نصیب سے ہاروں کی قسمت میں خود بخود دبے قدموں چلے آتی تھی۔ جیسے سندر روپ چاند کا برج عقرب میں جانے کا وقت جو بڑا منحوس مانا جاتا تھا۔ اور فریحہ کو لگتا تھا اس کی زندگی کا چاند بھی قمر در عقرب میں عمر بھر کے لیے داخل ہو گیا ہے۔

فریحہ کو آج اماوس بھری رات میں "ود ان ون نائٹ" کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔ ان الفاظ کا فریحہ کی زندگی پہ اتنا گہرا' بھیانک اور اچانک اثر پڑے گا۔ یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیا کسی کے ساتھ "راتوں رات" یہ حادثہ ہوا تھا؟ جو فریحہ کے دل اور اس کی زندگی پہ گزرا؟۔ وہ مایوں کے پیلے جوڑے سے میت کے سفید جوڑے تک آ گئی۔ راتوں رات میں' صرف ایک رات میں۔ یہی رحمان منزل جہاں روشنیاں جگ جگ کر رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ گونج رہی تھی۔ قبرستان کے سناٹوں سے بڑھ کر خاموش ہو چکی تھی۔ شادی کے سارے رنگ اتر چکے تھے۔ اور فریحہ کا مایوں و مہندی کا جوڑا اونچے پلنگ کے عین اوپر گول مول سا انتہائی خستہ حالت میں نوحہ کناں تھا۔ کانچ کی زرد اور ہری چوڑیوں کا ڈھیر کرچی کرچی فرش پہ پڑا اپنی اس ناقدری پہ رنجیدہ خاطر تھا۔ یہ تو صرف مہندی مایوں کا جوڑا اور چوڑیاں ہی تھیں جنہیں اپنی ناقدری کا الگ سے ہی صدمہ اٹھانا پڑا تھا۔ یہاں تو جیتے جاگتے انسان تک "بے مول" اور "بے قیمت" ہو چکے تھے۔

فریحہ اپنی اس ذلت' توہین اور ناقدری کا رونا کسے دکھاتی؟ وہ اپنے ٹوٹے دل کے کانچ اٹھا اٹھا کر کس کی ہتھیلی پہ رکھتی؟ اس کے وہ تایا جو اپنی "ناموس" عزت اور خاندانی حشمت کو بچانے کی خاطر فریحہ کے دل کا سودا کر آئے تھے۔ اس کی خوشی اور محبوب کو کسی اور کی جھولی میں ڈال آئے تھے۔ کیا اس کے جان سے پیارے تایا نے اچھا کیا تھا؟ وہ رات کی سیاہی سے پوچھ پوچھ کر تھک رہی تھی۔ رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کے کانچ اٹھا اٹھا کر زخمی ہو رہی تھی۔ کیا وہ اماوس کی طرح بدنصیب تھی جو اس کے نصیب کا ستارہ گردش کرتا کرتا کسی اور کے نصیب کی پیشانی پہ جگمگانے لگا تھا۔ اور وہ ماہ رو سرفراز' آسمان کا چمکتا چاند' اپنے تمام تر کروفر اور غرور کے ساتھ اس کی ذات کا مکمل افتخار چھین کر بڑی شان' بڑی آن اور بڑی مہمان بن کر اسی رحمان منزل میں جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ اس شبستان میں جسے فریحہ کے لیے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ خوب صورت خواب گاہ' جو فریحہ کے لیے خاص الخاص تیار کی گئی تھی اس پہ کس ہوشیاری کے ساتھ ماہ رو سرفراز نے قبضہ جما لیا تھا۔ کوئی ایسا قابض بھی ہوتا ہے؟ کوئی ایسا بھی سنگ دل ہوتا ہے؟ اور فریحہ نہ بول سکی تھی' نہ چیخ سکی تھی' نہ احتجاج کر سکی تھی۔ جبکہ ماہ رو سرفراز نے بڑی اعلا پائے کی سازشوں' منصوبوں اور چالوں کے ساتھ واویلا مچا کر عمر بھر کے لیے عون عباس کو اپنے دام میں کر لیا تھا۔ اور اس نے کتنی بڑی چال چلی تھی۔ ان ہی کے ہاتھوں ان ہی کا قتل عام کر دیا تھا۔ اور خود بے گناہ بھی رہی اور مظلوم بھی۔ نہ پھانسی ہوئی نہ دار پہ چڑھی۔ جس طرح وہ فریحہ سے اس کی زندگی اس کی خوشی زبردستی چھین چکی تھی۔ اسی طرح فریحہ جانتی تھی کہ اپنے حسن جہاں سوز کے ہتھیاروں سے ایک نہ ایک دن عون عباس کو بھی پسپا کر دے گی۔ کیوں کہ ماہ رو سرفراز کے پاس اداؤں کے' حسن کے'

چالوں کے تمام تر داؤ محفوظ پڑے تھے۔ وہ جو چاہتی' استعمال میں لے آتی۔

اور ابھی جب چند گھنٹے پہلے وہ دلہن کا حسین روپ سجا کر اپنی ساس کے جلو میں رحمان منزل کی راہداریوں میں سے گزر رہی تھی۔ تب پہلے سے گھر میں موجود عون عباس' بڑے ہال کے بند دروازوں کے اندرونی طرف اپنے باپ پہ اسی شدت کے ساتھ چلا رہا تھا جس شدت کے ساتھ وہ اس زبردستی کے نکاح کی رسم کے بعد چلایا تھا۔ غم و غصے سے بے حال تھا اور اس کے زہر میں بجھے الفاظ فریحہ کے جلتے بلتے دل پہ کسی پھوار کی مانند برس رہے تھے۔

"آپ نے اپنی ضد پوری کر تو لی ہے ابو! اسے بھگتنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ عون عباس کو جیتنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ یہ ماہ رو سرفراز کی بھول ہے کہ شاطرانہ چالوں سے انسان خریدے جا سکتے ہیں اور شاید خریدے جا بھی سکتے ہیں' لیکن عون عباس کو خریدنا اتنا سہل نہیں ہو گا۔" اس کے شعلوں میں لتھڑے الفاظ بڑے ہال کی کھڑکیوں سے باہر تک اس تکون کمرے میں بھی پہنچ رہے تھے جو فریحہ فرقان کی خواب گاہ میں شمار ہوتا تھا اور اس وقت کھڑکی کے پٹ کو ہاتھ میں پکڑے اس کی جلتی روح پہ سکون کی چھینٹیں گر رہی تھیں۔

"میں اس سازش کو "بو" پالوں گا اور اس کہانی کو زمین سے بھی اکھاڑ کر باہر لے آؤں گا جسے آپ کو سنا کر بے وقوف بنایا گیا تھا اور آپ آنکھیں بند کر کے اس پہ ایمان لے آئے۔" عون کی زخمی پھنکار میں اس شیر کی غراہٹ تھی جو اپنے شکار کی تلاش میں بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ فریحہ نے کھڑکی کا پٹ اور بھی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"آپ نے اسے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ ابھی تک غرا رہا تھا۔

"دیکھو' دیکھو..... اس کے انداز؟ سب کچھ کر کرا کے معصوم بن رہا ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہ ہو۔

ارے میں تو تمہارے عیبوں پہ پردہ ڈال کر اسے گھر لے آیا ہوں۔ اپنی اور تمہاری بھی نام نہاد عزت بچا لی ہے۔ ورنہ جو تم نے جرم کیا تھا اس کی کہیں معافی نہیں تھی۔" تایا رحمان بھی غرا اٹھے تھے۔ آخر عون کے باپ تھے۔ کیسے خاموش رہتے۔ باپ بیٹا ویسے بھی سیر اور سوا سیر کی واضح مثال تھے۔

"میں نے کیا جرم کیا تھا؟" وہ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھا۔

"یہ جرم نہیں تھا۔ ایک شریف آدمی کے گھر پہ اس کی غیر موجودگی میں دھاوا بولنا۔ اس کی بیٹی کو زدوکوب کرنا۔ جس کی وجہ سے وہ اسپتال میں جا پڑی تھی اور اس معصوم کی عزت....." آخر میں ان کا لہجہ کانپ سا گیا تھا۔ پورے وجود میں تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ غم و غصے سے بے حال کانپ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا اپنے ہی لخت جگر کو گولی سے اڑا دیں۔ وہ تو اسے منہ ہی نہیں لگانا چاہ رہے تھے۔ یہ تو عون تھا جو خود بخود اسی دلدل میں کنکریاں پھینک کر اپنے ہی اوپر گندی چھینٹیں ڈلوا رہا تھا۔ دراصل وہ اس ذلت کو بھول ہی نہیں پا رہا تھا جو اس نے پورے خاندان دوستوں' رشتے داروں اور مہمانوں کے سامنے جھیلی تھی۔

"کھاؤ قسم! تم سرفراز احمد کے گھر نہیں گئے تھے؟" وہ لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھور کر پوچھ رہے تھے یہ ایسا مقام تھا جس پہ عون جھوٹا پڑ سکتا تھا اور انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لیتے تو ان عذابوں میں نہ پڑتے۔ میں اس لیے نہیں گیا تھا وہاں..... میں تو....." اس کی وضاحت کا گلا تایا رحمان نے ایک ہی دہاڑ میں گھونٹ دیا تھا۔

"تم گئے تھے یا نہیں؟ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔" وہ غضب ناک انداز میں چلائے تھے۔ فریحہ نے اپنے دل پہ ہاتھ جا رکھا۔ جانے عون کیا جواب دے گا؟ اگر اس نے ہاں بول دیا تو؟

"آپ نہیں سمجھ رہے ابو! کچھ نہیں سمجھ رہے۔

وہ میرے پیچھے خود پڑی تھی۔ آپ کچھ نہیں جانتے' مجھے موقع تو دیں۔ کم از کم ایک موقع تو دیں.... میں آپ کو ساری بات بتادوں گا۔ میں تو....'' وہ جو دو ٹوک گفتگو کر کے مقابل کو دوسرا موقع ہی نہیں دیتا تھا بولنے کا لمحہ بھر کے لیے ہکلا گیا۔ کیونکہ تایا رحمان ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ کر چلا اٹھے تھے۔

''میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم کچھ اور بکواس کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تم سیٹھ سرفراز کے گھر گئے تھے یا نہیں؟'' ان کی رگیں مارے طیش کے پھول کر نیلی ہو گئی تھیں۔

''میں اسے روکنے کے لیے۔ اسے منع کرنے کے لیے اور اس کے باپ کو اس کے تمام کرتوت بتانے کے لیے گیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ باخدا' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ بہت آوارہ مزاج لڑکی....'' عون نے مارے طیش کے انتہائی فحش گالی بکی تھی جسے سن کر تایا رحمان گرج اٹھے تھے۔

''اپنا منہ بند رکھو ذلیل آدمی! خبردار' جو تم نے اسے اب دوبارہ گالی دی۔ وہ کل کیا تھی؟ میں نہیں جانتا' لیکن آج وہ میرے خاندان کی عزت ہے اور مجھے اپنی عزت کی حفاظت کرنا آتی ہے۔ اور رہی تمہاری بکواس تو.... اس کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ تم اب ہر قسم کی جھوٹی کہانی سنا کر اپنی ''میں'' کو برقرار رکھو گے اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کرو گے۔ تم میرے باپ نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں اور سب جانتا ہوں جو کچھ ہوا یا جو کچھ تم نے کیا تم میں ایسی غیرت ہوتی تو بار بار اس شرم ناک قصے کو دوبارہ مت چھیڑتے جس پہ میں نے مٹی ڈال دی تھی یا جس ذلالت کو سیٹھ سرفراز نے دفن کر دیا تھا اس کو اکھاڑنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے کیونکہ ہر دفعہ تمہارا ہی شرم ناک کارنامہ کھل کے سامنے آتا تھا اور میں تو منہ چھپاتا پھرتا اب تک اگر سیٹھ سرفراز میری التجا پہ کان نہ دھرتے۔'' وہ آنکھیں اور کان بند کر کے اپنی بات پہ زور دیتے تھے۔ اپنی بات منواتے تھے۔ اپنی ضد پر قائم رہتے تھے اور اپنی بات کو ہی حقیقت اور سچ تسلیم کرتے۔ باقی سب ان کے سامنے جھوٹ' بکواس اور چربہ تھا۔

''یہ تو سیٹھ سرفراز کی مہربانی جو انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح تم جیسے کمینے کے ساتھ کر دیا تھا۔ ورنہ تمہیں تو اس تمام بدنامی کے بعد کوئی شریف خاندان اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتا۔'' انہوں نے نفرت انگیز لہجے میں اس کی دکھتی رگ پہ پھر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم ہی بھڑک اٹھا۔

''میں مر نہیں رہا تھا سیٹھ سرفراز کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے بلکہ وہ خود مر رہی تھی مجھ پہ۔'' عون زہر خند ہوا تھا پھر اس نے دروازے کے پاس رکھی میز کو زوردار ٹھوکر ماری اور کمرے سے بکتا جھکتا نکل گیا تھا جبکہ تایا رحمان مارے غیض کے ہال میں ٹہلنے لگے۔ فریحہ نے آوازوں کو ختم ہوتا محسوس کر کے کھڑکی بند کر دی تھی اور اس کی پشت سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اسے تایا رحمان کی باتیں رہ رہ کر رلانے پہ مجبور کرتیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ عون نے جو کچھ کیا تھا اس کے نتائج میں وہ شریفوں کی فہرست سے نکل چکا تھا اور اسے کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی نہیں مل سکتا تھا' لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے ان کے اپنے ہی بھائی کی بیٹی اسے ہر الزام سے بری سمجھتی تھی۔ اس سے شادی کی خواہش مند تھی اور اس رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی۔

اگر عون برا تھا یا اس نے کچھ برا کیا تھا تو پھر سیٹھ سرفراز نے اپنی بیٹی کیوں اس کے ساتھ بیاہی تھی؟ کوئی بھی اس پہلو پہ نہیں سوچتا تھا۔ اور عون بقول ان سب کے کچھ غیر اخلاقی کام کر بھی چکا تھا تو ان سب کو کیا تکلیف تھی؟ اور ان سب نے مل کر فریحہ کو تختہ مشق کیوں بنایا؟ وہ عون کی اس کے ساتھ شادی ہو جانے دیتے۔ انہوں نے یہ شادی کیوں ختم کی تھی؟ آخر کیوں؟ کسی کو بھی فریحہ پہ رحم نہیں آیا تھا اور کوئی جانتا یا نہ جانتا' فریحہ تو جانتی تھی۔ اسی وقت سے جانتی تھی جب ماہ روئے رحمان پلازہ میں عون کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی تھی۔ پھر بارہا فریحہ نے محسوس کیا تھا۔ وہ اس

گھر میں عون کے لیے آئی تھی۔ اس کے گھر والوں سے عون کے لیے گھلتی ملتی تھی۔ وہ اپنا سکہ پہلے سے ہی جمانا چاہتی تھی اور اس کے گھر والوں کو اپنے حسن اور دولت کے جال میں قید کر کے مٹھی میں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں تک تو اس کی چالیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ پھر آگے عون تک رسائی کا مسئلہ تھا۔ اس کی زندگی میں داخل ہونے کے لیے پری پلاننگ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اتنا تو ماہ رو بھی جان گئی ہوگی کہ بہت آسانی کے ساتھ وہ عون عباس جیسے مضبوط قلعے کو فتح نہیں کر سکتی۔ پھر اس نے پوری منصوبہ سازی کے بعد عون کے باپ تک رسائی حاصل کی ہوگی۔ انہیں جھوٹ موٹ کے قصے سنا کر رام کر لیا ہوگا اور یقیناً "ماہ رو ایسا کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہ سب دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تھوڑا مشکل تھوڑا آسان۔ سو ماہ رو نے اپنا شکار حاصل کر لیا تھا۔ اس کے من کی مراد بر آگئی تھی۔ اسے وصل کی شب نصیب ہو گئی تھی اور آج وہ ماہ رو سرفراز فریحہ کے حصے کی زمین پر اپنے خوابوں کا شیش محل بنا رہی تھی۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک ماہ رو کو معاف نہیں کر سکتی تھی اور آج ماہ رو کس قدر شانت ہو گئی۔ کیونکہ اس نے عمر بھر کے لیے تمام تر دکھ، کرب، ذلت، بے چینی، آنسو اور اضطراب فریحہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا، لیکن کیا وہ فریحہ کے سپنوں کی سرزمین پہ اپنے لیے محبت کی کوئی فصل کاشت کر پائے گی؟ کیا وہ فریحہ کے آنسوؤں اور بددعاؤں کی زیر سایہ خوش گوار ازدواجی زندگی گزار پائے گی؟ اور کیا وہ حقیقت میں عون عباس کی محبت حاصل کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ کسی حال میں بھی نہیں۔ آخری سانس تک نہیں کیونکہ بیچ میں فریحہ فرقان کھڑی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک خلیج بن کر تن کے کھڑی تھی۔ وہ کبھی ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گی۔ وہ یعنی فریحہ فرقان عمر بھر کے لیے ان دونوں کے بیچ اماوس کی رات بن کر کھڑی رہے گی۔ وہ ساری زندگی عون عباس کے لیے ایک "گلٹ" کی صورت مجسم زندہ رہے گی۔ اسے احساس دلانے کے لیے۔

اسے کبھی حقیقی معنوں میں خوش نہ ہونے دینے کے لیے تاکہ وہ بھی زندگی کی آخری سانس تک جلے۔ زندگی کی آخری سانس تک سلگتا رہے۔ اگر فریحہ فرقان اپنی زندگی عون عباس کے نام پہ قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو پھر عون عباس کو بھی ساری عمر ماہ رو سرفراز کے ساتھ خوش نہیں رہنا تھا کسی صورت نہیں رہنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی فریحہ فرقان کی طرح جلنا اور سلگنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز کو بھی اس کی طرح تنہا زندگی گزارنا تھا۔ پھر ماہ رو سرفراز بھی سہاگ رکھتے ہوئے "بیوہ" جیسی زندگی گزارے گی۔ فریحہ کا سایہ کبھی اسے خوش نہیں رہنے دے گا کیونکہ فریحہ کا سایہ "اماوس" کا سایہ تھا۔

☼ ☼ ☼

سناٹا آج بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ آج بھی اس روز کی طرح پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا حالانکہ آج تو عون کی منکوحہ کو گھر میں بیاہ کر لے آئے تھے۔ پھر بھی سکوت تھا کہ دلوں کو عجیب سے کرب میں چکر پھیریاں دے رہا تھا۔ ہر طرف بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کا اپنا دل چین سے خالی تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ ان کی بیٹی کا دل بھی چین سے خالی تھا۔

اور کیا یہ فریحہ تھی؟ ان کی پڑھی لکھی فرمانبردار سنجیدہ مزاج نیک فطرت بیٹی۔ وہ تو اس وقت کوئی بدحال عمر رسیدہ عورت لگ رہی تھی۔ کوئی سودائی لگ رہی تھی۔ ان کے دل پہ جیسے گھونسا پڑا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ فریحہ کو اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ اور وہ جو اس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی بالکل ساکت ہو گئی۔ جیسے بجلی کے بٹن کو دبا دینے سے آواز بند ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی چابی کی گڑیا کی طرح خاموش اور ساکت ہو چکی تھی۔

"فریحہ! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" وہ ماں تھیں ان کا دل تڑپ گیا تھا۔ فریحہ نے آواز کی سمت گردن اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر پھٹی پھٹی آواز میں بمشکل بولی۔

"تو کیسی حالت بناؤں؟

جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ کیا میں خوشی کے شادیانے بجاؤں؟ اس کی امی کا دل پھٹنے لگا۔ آنکھیں بہنے لگیں۔ زبان سے عون کے لیے تنفر کا زہر گرنے لگا۔

"دنیا ایک عون پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ کمینہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔" انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر عون کو برا بھلا کہنا شروع کیا تھا۔ ورنہ عون کو اب بھی دل کوئی الزام دینے پہ راضی نہیں تھا۔ ان کے گزشتہ سارے خدشات وہمے وسوسے ماہ رو کی طرف سے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ ماہ رو کسی "چال" میں ہے۔ وہ عون کو ہتھیانا چاہتی ہے۔ ان کا دل ٹھیک ہی وسوسے سے پال رہا تھا۔ وہ سارے خدشے بے بنیاد نہیں تھے ان کے سارے وہموں کا جواب آج ماہ رو کا دلہنوں جیسا روپ تھا۔ تو وہ ان کے خدشات پہ مہر لگا کر آج حوروں سا روپ لیے ان کے دلوں پہ سانپ دوڑانے آگئی تھی۔ تو ماہ رو سرفراز ان کے عون کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر آگئی تھی۔

دل اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا عون ایسا کمزور نہیں تھا جو کوئی بھی ماہ رو اسے کسی چال کے ساتھ "جیت" جاتی۔ عون نام کی سلطنت کو اپنے نام کروالینا کوئی اتنا سہل نہیں تھا۔

اور اس وقت فریحہ کو تسلی دیتے ہوئے اس کے جلتے دل کو پرسکون کرتے ہوئے وہ یہی باتیں اسے سمجھا رہی تھیں۔

"دیکھ لینا وہ دو دن بھی نہیں ٹکے گی۔ جینا حرام ہو جائے گا اس کا یہاں۔ عون کے ساتھ نباہ کرنا ایسی نازک اندام مہارانیوں کے بس کی بات نہیں۔ تم دیکھتی رہنا۔ جس طرح سے آئی ہے۔ ویسے ہی منٹوں میں چلی جائے گی۔"

"نہیں امی! یہ خونی بلا نہیں جائے گی۔ یہ عون کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانس لے گی۔ اس کے پاس حسن جیسا باکمال ہتھیار ہے۔" فریحہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے اذیت سے کہا تھا۔

"عون ایسا کچا نہیں۔ تو بھائی جی نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ تو کبھی نہ مانتا۔ بھائی جی اور تمہارے ابا کو جانے کیا کیا بتا کر ان کے دماغ سن کر دیے تھے۔ وہ کچھ سنتے ہی نہیں تھے۔ کہتے یا عون کو مار ڈالیں گے یا خود کو۔ ورنہ نکاح کی حامی بھرے۔" انہوں نے پھر سے زخم ادھیڑ دینے والا ذکر چھیڑ لیا تھا۔

"جو ہونا تھا۔ وہ ہو گیا۔ ماہ رو کی پلاننگ تو کامیاب ہو گئی۔ وہ عون کو پانا چاہتی تھی بس پا لیا۔" فریحہ کے دل پر آرے سے چل پڑے تھے۔

"زندگی کا اختتام تو نہیں ہو گیا نا۔ تمہارا دل توڑنے والوں کو سزا ضرور ملے گی۔ تم دیکھ لینا۔ عملی زندگی میں آ کر کیسے عشق کا بھوت اترتا ہے۔ ایسی منحوس آئی ہے جس نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کر دیا ہے۔" فریحہ کی امی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"میرا دل اسی لیے گھبراتا تھا۔ یہ خدشے بے بنیاد نہیں تھے امی! دیکھا نا۔ ماہ رو نے میرا دل اجاڑ دیا۔ مجھے برباد کر دیا۔ اور خود عون پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی۔" فریحہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"میں تو کہتی تھی۔ اس چڑیل سے دور رہو۔ اس کے سائے سے بھی دور رہا کرو۔ اس نے پشت میں خنجر گھونپ دیا نا۔" فریحہ کی امی کو نجانے کیا کچھ نہیں یاد آ گیا تھا۔

"میں نے تو نمبر بھی بند کر دیا تھا۔ تعلق بھی توڑ لیا تھا۔ پھر بھی میری بدقسمتی بن کر سامنے آ گئی۔" فریحہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ یہ رونا تو اب اس کے ہمیشہ ہمیشہ ساتھ ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

رات تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔

کھڑکی کے باہر لٹکی بیلوں سے موتیے اور چنبیلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ انتہائی معطر خوب صورت اور حسین روح میں اتر جانے والی مہک نے پورے روم کو مہکا دیا تھا۔

رات کی رانی کا سحر سرچڑھ کے بول رہا تھا۔ اور اس وقت ماہ رو جہازی سائز بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے آنے والے سندر وقت کی آہوں کو سن رہی تھی۔ وہ حسین گھڑی جس کا انتظار دل میں میٹھا میٹھا درد جگاتا تھا۔ وہ ہی دلنشین ساعتیں جن کی آمد آمد کا چرچا پلکوں کو بار حیا سے جھکا رہا تھا۔

وہ جو اس کی جنوں خیز قسم کی محبت تھا۔ اس وقت محبوب بن کر آئے گا۔؟

اس وقت اتنے سحر انگیز ماحول میں دل کے اندر ہلکے ہلکے وسوسے بھی سر ابھار رہے تھے۔ جو باتیں اپنی ہی سرخوشی میں بہت پہلے اس نے نہیں سوچی تھیں وہ اس وقت بہت نازک صورت حال میں گھبرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس پہ دھیرے دھیرے کچھ خوف اور گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ عون کے بارے میں سوچتی دل اتھاہ گہرائیوں میں خود بخود ڈوبنے لگا تھا۔ عون کہاں تھا؟ اس کے گھر رخصتی کے وقت بھی موجود نہیں تھا۔ وہ کس طرح سے عون کے موڈ کا اندازہ کرتی؟ وہ کس طرح عون کے رویے سے اس کی کیفیت کو جانچتی۔

وہ گھر آکر بھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ کھانے کے وقت بھی اندر نہیں آیا۔

آخر کچھ تو تھا جو اس کے دل میں وہم جگا رہا تھا۔ پریشان کر رہا تھا۔ اور ماہم کہتی تھی۔ اس کی مرضی تھی تو تب ہی اچانک نکاح اور رخصتی ہو گئی۔

تب بھی ماہ رو کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ نکاح اور رخصتی پھر گھر والوں کا سرد سا رویہ کچھ بھی نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

یہ "مرضی" سے زیادہ زبردستی والی شادی لگ رہی تھی۔ لیکن عون کے گھر والوں کو کیا ضرورت تھی اس پر دباؤ ڈال کر ماہ رو سے شادی کرواتے؟ وہ خود ہی ہر خدشے کو اٹھاتی اور دوسرے ہی لمحے گرا دیتی۔ پھر بھی دل کو چین نہیں تھا۔ وہ کہاں تھا؟ کیوں نہیں آرہا تھا؟ وہ تھکن سے ٹوٹتے ہوئے انگ انگ کے ساتھ عون عباس کا انتظار کر رہی تھی۔

"معا" دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تو بے ساختہ وہ سمٹ کر چونک گئی تھی۔ ایسے ہی غیر ارادتاً" اس کی نگاہ سنہرے گھڑیال پر پڑی تو اچانک ماہ رو چوکنا ہوئی تھی۔ گھڑیال پہ تین بجنے کا الارم گونج رہا تھا۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولنے پر آمادہ کیا۔

سامنے ثنا ہی کھڑی تھی وہ ثنا جو کھانا بھی دے کر گئی تھی۔ اب نجانے کیوں آئی تھی؟ ماہ رو بمشکل سیدھی ہوئی۔ ثنا نے ایک نظر ماہ رو کے تھکے تھکے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر جوں کی توں کارنر پہ رکھی ٹرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کھانا پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ماہ رو نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ثنا کو کچھ بے چینی سے ہوئی تھی۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا ماہ رو!"

"بھوک نہیں ثنا بھابھی!" اسے کچھ تو جواب دینا ہی تھا۔

"کیوں بھوک نہیں؟" ثنا نے کچھ تفکر سے کہا۔ کیونکہ گزشتہ رات وہ اسپتال میں رہ کر آئی تھی اس لیے ثنا کو کچھ پریشانی سی محسوس ہوئی تھی۔ کیا پتا' طبیعت خراب ہو۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بے زاری دکھائی تھی۔ واقعی ہی کھانے کو دیکھ کر طبیعت اوب رہی تھی۔ اور خوشبو جیسے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔

"لیکن کھانا دل میں نہیں جاتا۔ معدے میں جاتا ہے۔" ثنا نے ماحول پر چھائی کثافت کو کم کرنے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ تب ایک مرتبہ تو ماہ رو کا دل چاہا تھا ثنا سے دل میں اٹھتے سوالوں کے جواب پوچھ لے۔

لیکن اس کے سارے سوال اندر ہی اندر دم توڑ گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں پوچھ پائی تھی۔

"تو پھر میں دودھ لے آتی ہوں۔ کچھ معدے میں تو جائے گا نا۔" ثنا کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ ماہ رو نے فوراً" نفی میں سر ہلایا تھا۔

"پلیز بھابھی! دودھ نہیں۔ میرے سر میں آل ریڈی (پہلے ہی) درد ہے۔ میں ٹھنڈا دودھ نہیں لوں گی۔"

"تو پھر چائے لے آتی ہوں۔" ثنا نے نرمی سے

کہا۔ تب سے لے کر اب تک ثنا ہی ماہ رو کے کمرے میں کئی مرتبہ جھانک کر اس کا احوال پوچھ رہی تھی۔ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شاید مریم سو چکی تھی۔ اس کے بیٹے کی طبیعت بھی نہیں ٹھیک تھی۔ اور کائنات بھی نجانے کہاں غائب تھی۔ وہ تو دکھائی بھی نہیں دی۔ ماہ رو کو خاصا دھچکا لگا تھا۔ "کیا کائنات بھی اس کے آنے پر خوش نہیں تھی۔"

پھر اس کی سہیلی فریحہ بھی نظر نہیں آئی۔ کم از کم فریحہ تو آتی۔ گو کہ اس کی شادی بہت اچانک ہوئی تھی وہ فریحہ کو اعتماد میں بھی نہیں لے سکی تھی پھر بھی فریحہ کو آنا تو چاہیے تھا۔ وہ رخصتی کے وقت بھی ماہ رو کے گھر نہیں آئی تھی' اس کی امی بھی نہیں تھیں۔ کیا یہ لوگ گھر میں موجود تھے؟ اگر تھے تو پھر دکھائی کیوں نہیں دیے۔

"بھابھی فریحہ کہاں ہے؟" ماہ رو نے بڑے آرام سے ثنا کو مخاطب کر کے فریحہ کی غیر موجودگی کے متعلق پوچھ لیا تھا۔ یوں کہ ثنا کا عجیب ہی انداز میں منہ کھل گیا۔ اور شدید حیرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ کیا یہ ماہ رو مذاق کے موڈ میں تھی؟ یا پھر فریحہ پہ طنز کر رہی تھی؟ یا فریحہ کو جلانا مقصود تھا؟ ظاہر ہے فریحہ کی جگہ اس کی سیج پر قبضہ جما کر بیٹھی تھی اور فریحہ کے متعلق استفسار کر رہی تھی۔ کیسی حیران کن بات تھی۔

"اس وقت تو فریحہ سو چکی ہو گی۔" ثنا نے ذرا مبہم سا جواب دیا تھا۔

"لیکن دوپہر' سہ پہر' شام اور رات کو بھی وہ نظر نہیں آئی۔" اس نے پھر سے سوال داغا تھا۔ "کیا تب بھی سو رہی تھی؟" وہ عام لہجے میں لاپروائی سے بولی۔ ثنا جیسے تعجب میں گم ہو گئی تھی۔ کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ وہ اس کا چہرہ کھوجتی رہی تھی۔ کچھ سوچتی رہی تھی۔ یہ کس طرح سے ممکن تھا کہ ماہ رو انجان رہتی؟ کیا اسے عون نے نہیں بتایا؟ اور عون نے بھلا کیوں نہیں بتایا ہو گا۔ ایک طے ہوئی شادی اچانک ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ اور ماہ رو اس طرح انجان پن اور بھول پن سے پوچھ رہی تھی جیسے کچھ اتا پتا ہی نہ ہو۔ ثنا دل ہی دل میں ماہ رو کی لاجواب ایکٹنگ کی قائل ہو گئی۔

"میں تو سوچ رہی تھی فریحہ سے لمبی گپ لگاؤں گی۔ اور اسے یہ بھی بتاؤں گی اس قدر اچانک یہ سب کیسے ہوا۔ فریحہ تو مجھ سے ناراض ہو گی۔ میں نے اسے کچھ بتایا جو نہیں۔ ایکچوئیلی! فریحہ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔" ماہ رو نے مزید اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

"فریحہ کیسے آسکتی ہے؟ وہ تو ابھی تک سوگ میں ہے۔ سوگوار ہے بے چاری۔ اس کے ساتھ کیا کچھ کم ہوا ہے؟ اسے تو سنبھلنے میں بڑا وقت لگے گا۔" ثنا نے اچانک بول کر اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکال لیا تھا۔ گو کہ ثنا کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔ نہ وہ طنز کر رہی تھی۔ نہ اس کے الفاظ ایسے تھے جو برے لگتے۔ ثنا نے خاصے محتاط لفظوں کا چناؤ کیا تھا۔ کیونکہ ماہ رو کے ساتھ اس کا رشتہ بہت نازک ہو چکا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی جو ماہ رو کو برا لگتا۔ یا پھر وہ عون کو پہلی ہی رات شکایتاً" بتا دیتی۔ اور ثنا کا امپریشن نئی نئی امیر ترین دیورانی پہ برا پڑتا۔ بہرحال فریحہ سے لاکھ ہمدردی سہی' وہ اپنی سسرال میں کھڑی تھی اور خاصے اکھڑ مزاج دیور کی ناراضی مول نہیں لے سکتی تھی۔

"اس کی سوگواریت یا پریشانی کی وجہ کیا ہے؟" اب کہ ماہ رو نے خاصی سنجیدگی بھرے تفکر سے پوچھا تھا۔ عون اپنی شادی توڑ کر' مہندی کے پنڈال سے سیدھا نکاح کر کے واپس لوٹا تھا اور یہ محترمہ جانتی تک نہیں تھیں کی فریحہ کے ساتھ کیا ہوا؟ حد ہی حد تھی۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹی ہے۔ اس کے خواب ٹوٹے ہیں۔ جس بارات کا اسے انتظار تھا وہ آئی نہیں۔ تو کیا وہ شادیانے بجائے؟" بالآخر ثنا نے دھیمی مگر طنزیہ آواز میں ماہ رو کے سارے طبق روشن کر دیئے تھے وہ دلہناپے کا روپ بھلا کر ایسی ہکا بکا ہوئی کہ اپنی جگہ سے پوری کی پوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیونکہ شاک ہی ایسا تھا۔

"فریحہ کی شادی ٹوٹ گئی؟ کیا اس کی شادی ہو رہی

تھی؟ اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ انوائٹ تک نہیں کیا۔ ہماری یک جان دو قالب والی دوستی نہ سہی۔ تاہم فرینڈ شپ تو ضرور تھی اس نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔" پہلی مرتبہ ماہ رو کی آواز میں کچھ خفگی اور شاک والی کیفیت نمایاں ہوئی تھی۔ اسے شدید دکھ ہوا۔ کیا فریحہ نے اسے اپنی خوشی میں بلانے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا؟ افسوس ہی افسوس تھا۔ اور ادھر ثنا خود بھی انتہائی تعجب کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے ماہ رو کی حیرت، شاک اور خفگی اب کی دفعہ کوئی اداکاری نہیں لگی تھی۔ تو کیا ماہ رو واقعی ہی انجان تھی؟ لیکن وہ انجان کیسے ہو سکتی تھی؟

ثنا کا دماغ تو اس گورکھ دھندے میں الجھ کر بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ کیونکہ دکھلاوا کم از کم اس قدر شفاف نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جو چونکا دیتا ہے۔ اور ایسا دقیق ڈھکوسلہ کرنا آسان بھی نہیں۔ ثنا کو ماہ رو کے انجان پن پہ یقین آ گیا تھا۔

"فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی کیا ہوا تھا؟" ماہ رو کے اگلے سوال نے ثنا کا دماغ پھر سے گھما ڈالا تھا۔ اس کا منہ پھر سے تعجب بھرے انداز میں کھل گیا تھا۔ گو کہ اسے امید تھی ماہ رو اگلا سوال یہی کرے گی پھر بھی۔ اور ابھی ماہ رو کو جواب دینا چاہتی ہی تھی جب دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا تھا۔ ثنا گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کی سیاہی سپیدہ صبح میں نہیں ڈھل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا رات بھی آج ٹھہری گئی ہے۔

یوں ہی بے سبب زندگی کی سویر پہ شام غالب آ گئی تھی۔ ہر طرف ویرانی، سیاہی اور اندھیرا تھا جو ڈھلتا ہی نہیں تھا زندگی میں اچانک موڑ آتے ہیں۔ پھر بھی ذہن و دل انہیں قبول کر لیتا ہے۔ ہر حادثے کے بعد کی صورت حال کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ موڑ اور حادثے اس طرح بھی آتے ہیں جو برسوں ذہن و دل کی تختی سے مٹ نہیں سکتے۔ کھرچنا چاہو تب بھی نہیں۔ بھلانا چاہو تو تب بھی نہیں۔

عون عباس کی زندگی میں بھی اچانک ایک موڑ آیا تھا۔ جو زوردار حادثے کا سبب بنا تھا۔ اور اس حادثے میں عون عباس کا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ عموماً" حادثے بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی قید تک سے آزاد کر ڈالتے ہیں۔ لیکن عون کی زندگی کا حادثہ بس یہاں تک محدود نہیں تھا۔ وہ اس حادثے میں زندگی کی حد تک بچ گیا تھا۔ لیکن باقی سب اس کا لٹ چکا تھا۔ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کے اعتبار کو کھویا تھا۔ اپنے بھائیوں کے اعتماد کو کھویا تھا۔ اپنے وقار، عزت، انا اور کردار کو کھویا تھا۔

اس نے بڑی گہری ضرب کھائی تھی۔ بڑی ذلت اٹھائی تھی۔ ہر آنکھ کی نفرت برداشت کی تھی۔ اپنوں کی بیگانگی کا مزہ چکھا تھا۔ جب وہ لوگ اسے بے یقین نگاہ سے دیکھتے تو عون کا دل چاہتا وہ ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔ جب وہ لوگ بے اعتباری کا مظاہرہ کرتے، اس پر یقین نہ کرتے، اسے جھوٹا، ڈھونگی، اور منافق سمجھتے۔ اس پہ کبھی اعتبار نہ کرنے کا اعلان کرتے تب پورے کا پورا عون عباس کنگال ہو جاتا تھا۔ تو اس کا دل چاہتا ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑا دے۔ تباہ کر دے۔

کوئی دو گھڑی اس کے پاس کھڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ ہر سو ذلت ہی ذلت تھی۔ اور اس ذلت کا سبب صرف ایک ذات تھی۔ جو اس کی سزا بن کر نہیں بلکہ انتقام بن کر اس گھر میں آئی تھی۔

وہ غیض کے عالم میں اٹھتا، چلتا، گرتا اور پھر سر تھام کر دہاڑنے لگتا۔ یہ اس کے انتہائی ڈپریسڈ (پریشان) ہونے کو ظاہر کرتا تھا۔ معاً" دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی لکڑی کے بھاری پاٹ کھلے اور بند ہوئے تھے۔ عون نے لہو رنگ خونی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ کوئی دبے قدموں اس کی پشت کے قریب آ گیا۔ وہ آنے والے کی گہری افسردہ سانسوں سے ہی سمجھ گیا تھا کہ کون اس کے پیچھے کھڑا ہے؟

تائی نے دل میں اٹھتی اذیت کی لہر کو دبا کر ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پہ رکھا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب ہی دیوان پہ بیٹھ گئی تھیں۔

ماں کو دیکھ کر سیدھا ہونا ہی پڑا تھا۔

"عون! تم نے کھانا نہیں کھایا۔ نہ کل شام نہ صبح نہ دوپہر۔ اور ابھی دیکھو' اگلی سویر بھی آرہی ہے۔ بیٹا! یہ دودھ تو پی لو۔" تائی کی آواز میں سابقہ کسی بات کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بس چاہتی تھیں کہ کم از کم ان کے سامنے عون ٹھیک رویہ رکھے۔

"جب موڈ ہوا کھالوں گا۔ کس کو تکلیف نہیں دوں گا۔"

"عون! میری جان! ادھر دیکھو؟ میرا کیا قصور ہے؟ مجھ سے کیوں ناراض ہو؟" تائی نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا سرخ کرب اذیت کے تاثرات سے سجا چہرہ تھام کر اذیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ تب عون کچھ بے چین ہو گیا تھا۔

"میں نے کب آپ سے کچھ کہا۔ جو میرے ساتھ ان لوگوں نے کیا۔ اس میں آپ کا قصور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ دکھ مجھے اس بات کا نہیں ہے۔ کہ ماہ رو نے اپنے مقام سے گر کر ابو وغیرہ کو ورغلایا اور مجھے سارے زمانے میں بدنام کر دیا۔ تکلیف مجھے ابو کی بے اعتباری کی ہے۔ کیا ابو مجھے نہیں جانتے تھے؟ میں نے کب ان کا سر جھکایا تھا؟

اگر ماضی میں میرا کوئی شرمناک قصہ ابو تک پہنچا ہوتا تب تو وہ اعتبار ہی کر لیتے۔ کہ میں ایسا ویسا ہوں۔ اور مجھ سے ہر برے فعل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب میرا ماضی شفاف تھا تو حال اچانک اتنا برا اور بدنما کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ جسے گنگا میں نہائی سمجھ کر آپ بیاہ لائے ہیں۔ اس پہ بھی مجھے افسوس نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مقام سے گرا ہوا ہر کام کر سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی سوسائٹی میں فیشن ہے۔ لیکن میں اس کی چالبازیوں اور گندے لائف اسٹائل کے چنگل میں نہیں آؤں گا۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں اس عورت سے بڑا سخت قسم کا انتقام لوں گا۔ ابو نے اسے عزت دار طریقے سے گھر لا کر مجھے سزا نہیں دی۔ بلکہ مجھے میرا انتقام پورا کرنے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔

میں اسے ایسی سزا دوں گا۔ کہ عمر بھر یاد کرے گی۔ جو کچھ میں نے کھویا ہے۔ اس عورت کو بھی کھونا پڑے گا۔" اس کے دھیمے سلگتے لہجے میں زخمی سانپ سی پھنکار تھی۔ تائی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔

"عون! تو پاگل ہو چکا ہے؟ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں' بہو' بیٹیوں اور بیویوں کی قدر' عزت کی جاتی ہے۔ اور تم....." ان کا دل پھڑپھڑانے لگا تھا۔ عون کے ارادے تو انتہائی خطرناک لگ رہے تھے۔ آخر وہ ماہ رو کے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

"نہیں عون! ہرگز نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ' بھلانے کی کوشش کرو۔ تم اپنے باپ کو جانتے تو ہو۔ اس لڑکی کے ساتھ کچھ برا کیا تو پھر سے گھر میں جنگ کا طبل بج جائے گا۔"

کیا خبر' اندر اپنے کمرے میں جاتا تو کچھ مزاج میں تبدیلی آجاتی؟ ماہ رو کو دیکھ کر شاید حواسوں پہ چڑھی گرمی اتر جاتی۔ چاہے وہ کسی بھی سازش کے ذریعے آئی تھی۔ اب آتو چکی تھی۔ ان کی بہو تھی۔ گھر کی عزت تھی۔ انہوں نے ماہ رو کے لیے اپنے دل میں تھوڑی جگہ بنالی تھی اور انہیں لگتا تھا ماہ رو کی موہنی صورت دیکھ کر عون بھی پگھل جائے گا آج نہ سہی کل تک اس کا غصہ اتر جائے گا۔ لیکن فی الحال انہیں عون کو بہلا پھسلا کر ماہ رو کے پاس بھیجنا تھا۔ وہ بے چاری تھکی ہاری جانے کب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

تائی خود بھی ایک ماں تھیں' ان کا جلدی دل پسیج گیا تھا اور وہ چاہتی تھیں عون اپنے کمرے میں جائے۔ آرام کرے۔ ٹھنڈے دل سے سوچے۔ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے کیا خبر' اسی میں بہتری ہو۔ وہ ہمیشہ مثبت رخ پہ سوچتی تھیں۔ اسی لیے مطمئن رہتی تھیں جو کچھ ہوا تھا وہ واقعی ناقابل قبول تھا۔ دل و دماغ کو ہی نہیں زندگی کو بھی جھنجوڑ چکا تھا' لیکن اب گزرے برے وقت پہ رونے اور ماتم کرنے سے بہتر تھا آنے

والے وقت کو اچھا بنالیا جاتا، لیکن یہ باتیں عون کو سمجھانا انتہائی کٹھن تھا۔

"عون اٹھو، اپنے کمرے میں جاؤ۔ دیکھو بیٹا! جو گھر میں گنے چنے مہمان رہ گئے ہیں انہیں باتیں بنانے کا موقع مت دو۔ وہ کیا سوچیں گے فریحہ کو ٹھکرا کر اپنی من پسند دلہن ڈنکے کی چوٹ پہ لایا ہے اور اسے بھی دیکھنا گوارا نہیں کر رہا کیا اسی میں خرابی ہے؟ ایسے فضول تبصروں سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ دیکھو، دلہن سے اچھی طرح بات کرلینا...... بیٹا! میری مجبوری سمجھو۔ اب میں مزید ماہ رو کی وجہ سے تم دونوں باپ بیٹے میں دوریاں نہیں دیکھ سکتی۔ اور وہ ماہ رو کے لیے بہت حساس ہو رہے ہیں۔" تائی نے نگاہ چرا کر جیسے التجا کی تھی۔

"ظاہر ہے، ان کے بیٹے نے ماہ رو کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کو بے عزت کیا ہے۔ اغوا کرنے کے لیے اس کے گھر دھاوا بولا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں معصوم ہے۔ مظلوم ہے۔ وہ کیوں نا حساس ہوں گے۔" اس نے مارے غصے اور تنفر کے دودھ کا گلاس اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ پھر تن فن کرتا ہال کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جارحانہ قدموں کی دھمک اس کمرے کی طرف جاتی سنائی دی تھی جس کمرے میں ڈنکے کی چوٹ پہ آئی ماہ رو جلوہ افروز تھی۔ تائی نے خوف کے مارے پھڑپھڑاتے دل پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ ماہ رو کی سلامتی کے لیے دعائے خیر کی تھی۔

☆ ☆ ☆
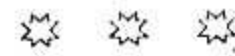
اور پھر وقت کے بجتے گھنگروؤں پہ بالا خر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ صحرا میں باد صبا چل پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا گھٹن بھرا سماں ٹوٹ گیا تھا جس کا اختتام ہو گیا تھا۔ وہ دیوان عام سے نکل پڑا تھا۔ اس کے قدموں کا رخ ماہ رو کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اسے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا دل ایک ایک قدم پہ اعلان یار کر رہا تھا۔ اس کی مشک بار پلکوں پہ حیا کا بوجھ پڑا اور وہ جھک کر گلاب رخساروں کو سلام پیش کرنے لگیں وہ قریب آرہا تھا۔ قریب آرہا تھا۔ قریب آچکا تھا۔ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ، ماہ رو کا دل سن رہا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کو ماہ رو کا دل گن رہا تھا۔ پھر جب وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تب لمحہ بھر کے لیے ماہ رو کا دل رک سا گیا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تر بتر تھیں وہ کیسے پیش آئے گا؟ وہ کیا کرے گا؟ اور ماہ رو کو اپنے گھر میں ایک ہی رات کے اندر ڈھیر ساری بے زاری اور نفرت کے باوجود لے کر آنے کی کیا توجیہہ پیش کرے گا؟ کیا اس کا دل پلٹ گیا۔ وہ اچانک دل کی زمین پہ اگ آنے والی محبت کا حرف حرف سنائے گا۔ ماہ رو سرفراز نے اندھا دھند چلتے ہوئے، بے خیالی اور عالم جنون میں محبت کی ایک فصل کاشت کی تھی۔ آج اس فصل اور گلشن کا حقیقی مالک آگیا تھا۔ اپنے پیار کی برسات میں غنچہ غنچہ بھگونے۔ اس کا جھکا سر پھر اٹھ نہ سکا۔ کیونکہ عون عباس اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ ماہ رو کو کچھ عجیب سا لگا۔ وہ کھڑا کیوں تھا۔ مقابل بیٹھ جاتا۔ اس کا خاموش ہونا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں تھا؟ ماہ رو کا خوش رنگ دھنک اوڑھ کے لہراتا دل کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی تک اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ کسی ننگی تلوار کی مانند۔ آخر کیوں؟ ماہ رو کو خود ہی اس عجیب طرح کے فسوں کو توڑ کر گردن کچھ اٹھانا پڑی تھی۔ اور پھر اس کی سحر طراز آنکھیں جیسے عون عباس کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔ اس چہرے پہ کیا کچھ نہیں تھا۔ غصہ، حقارت، نفرت، کراہت، گھن...... اور یہ ماہ رو تھی جسے کبھی تاثرات پڑھنے، چہرے کھوجنے ہرگز نہیں آئے تھے۔ وہ تو سمجھ ہی نہ پائی کہ آنکھوں اور چہروں کی کہانیاں کیا ہوتی ہیں؟ چہرے کتابیں کیسے بن جاتے ہیں؟ اور لوگ ان کتابوں کو حفظ کیسے کرلیتے ہیں؟ لیکن آج عون عباس کے تاثرات کو دیکھ کر اسے چہرے پڑھنے کے فن کا پتا چل گیا تھا۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ چہرے کس طرح سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور یہ عون عباس کا چہرہ تھا۔ اور یہ ماہ رو کے محبوب کا چہرہ تھا۔ غیض و غضب کے رنگوں سے سجا، شدید نفرت کے

تاثرات سے برہم' زہریلے تیوروں سے اٹا۔ اور ماہ رو کا دل ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اب وہ ساکت جامد نہیں تھا وہ اب بول رہا تھا۔ اور کیا وہ بول رہا تھا؟ اور وہ نہ ہی بولتا تو اچھا تھا۔

"اور بالآخر تم نے اپنا باکمال عشق پالیا۔ یہی کہا تھا نا تم نے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے دیوانگی کی حد تک اور تم نے یہ بھی کہا تھا۔ میں اسے ثابت کروں گی... کہا تھا نا... اب بولتی کیوں نہیں ہو... وہ لمبی زبان کہاں بھول آئی؟..." وہ کسی وحشی جانور کی طرح ماہ رو پہ جھپٹ پڑا تھا۔ انتہائی تکلیف و اذیت کی لہر نے ماہ رو کو یک دم چلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ اس کے تیور دیکھ کر ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو بھی بکواس کرے گا۔ ماہ رو اس کا جواب نہیں دے گی۔ وہ خوف و ہراس کے عالم میں ٹھٹھر گئی تھی۔ عون کا رویہ اس کے گمان کی آخری حد پہ بھی کہیں نہیں تھا۔ اس کے تصور میں بھی کہیں نہیں تھا۔ ایسا بہیمانہ استقبال؟ ماہ رو کا دل سینے کی سرحد توڑ کر چلایا۔ وہ اسے اپنی چاہ سے یہاں لا کر اتنا ذلیل کر رہا تھا؟ آخر کیوں؟ وہ اسے اذیت دے رہا تھا آخر کیوں؟

"چلاؤ مت' میری بات کا جواب دو۔ اور اپنا کہا پورا کرو... اپنے عشق کو ثابت کرو۔" وہ اس کے کان کی لوؤں پاس غرایا تھا۔ شدت درد کی وجہ سے ماہ رو کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ بے آواز رونے لگی۔

"اور کہو نا... تم نے ثابت کر دیا اور واقعی ثابت کر دیا۔ بڑی ڈینجرس پلاننگ تھی تمہاری۔ بڑے بڑے سورماؤں کے تجربوں اور عقل کو سلب کر دیا تم نے۔ بڑے زہریلے ناگ سے ڈسوایا تم نے۔ کسی کو دوسرا سانس نہ لینے دیا۔ کچھ اور تک نہ سوچنے دیا۔ میں تمہاری شاطرانہ ذہنیت کی داد دیتا ہوں اور آج یہ داد و تحسین کی رات ہے۔ اور میں تمہیں اپنے ہی انداز میں تحسین پیش کروں گا۔ پھر تم سرپرائزڈ رہ جاؤ گی۔" اس نے ماہ رو کے گال میں پنجے گاڑ کر جھٹکا دیا تو وہ ایک ہی وار میں کراؤن سے جا لگی تھی۔ اس کا سر بری طرح سے چکرا گیا تھا۔

"چھوڑو مجھے! وحشی آدمی! تم پاگل ہو چکے ہو۔" ماہ رو کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے درد کی شدت سے چلا کر کہا تھا۔ اس کی تکلیف کو محسوس کر کے عون کچھ اور شیر ہوا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا ماہ رو تکلیف سے روئے' چلائے... ہاتھ جوڑے' پیروں میں گرے۔

"ہاں... پاگل تو میں ہو چکا ہوں' مگر تمہاری محبت میں نہیں... تمہاری نفرت میں پاگل ہو چکا ہوں۔ اور تم اس پاگل کا' پاگل پن آہستہ آہستہ دیکھتی رہو گی۔ پھر عادی ہو جاؤ گی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور میں تمہیں طلاق کبھی نہیں دوں گا۔" اس نے ادھورا جملہ مکمل کر دیا تھا۔ ماہ رو گھٹنے پہ سر رکھے اپنی سسکیاں دبانے لگی۔

"میں طلاق لینے کے لیے آئی بھی نہیں تھی۔ میں تو تمہارے لیے آئی تھی' لیکن تم وہ نہیں... تم تو کوئی اور ہو۔" اس کا دل اونچی آواز میں کرلاتا رہا۔ عون عباس سابقہ انداز میں دھاڑتا رہا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ کر سزا دوں گا۔" اس نے بڑے کروفر کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا۔

"یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیسی سزا دو گے؟ کیوں دو گے؟ میرا جرم کیا ہے؟ میرا گناہ کیا ہے؟" اس کی سسکاریاں کمرے کی خاموش فضا میں گونجتی رہی تھیں۔ ماہ رو روتی رہی تھی اور بڑے زخمی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ عون اس کے معصومانہ سوال پہ پھٹ پڑا تھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے۔ مجرم اپنے جرم سے خود بھی آگاہ نہیں۔ اپنا گناہ مجھ سے پوچھتی ہو؟ ذرا اپنے آپ سے تو پوچھو' اپنے ضمیر سے پوچھو۔ کیا تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا؟ کیا تم نے کسی اور کی جگہ نہیں لی؟ کیا تم نے کسی اور کے ارمانوں کا خون نہیں کیا۔ کیا تم نے کسی کا دل برباد نہیں کیا؟۔ میں اپنے ساتھ کیے تمہارے ہر جرم کو نظر انداز کر بھی دوں؟

تمہارے حسن کی تابناکیوں سے وقتی طور پر بہل بھی جاؤں تو اپنے اس ضمیر کا کیا کروں؟ جو مجھے ابھی تک چین لینے نہیں دے رہا۔ مجھے پل صراط پہ کھڑا کیے ہوئے ہے۔ میرے اندر آگ لگا رکھی ہے۔ میرے اندر زہر بھر رکھا ہے۔ اس ذلت کو بھول بھی جاؤں جو مجھے تمہارے توسط سے ملی ہے تو اس فریحہ کا کیا کروں؟ جس کی آہیں میرا دل پھاڑتی ہیں جس کے چہرے کی زردی، جس کی آنکھوں کی ویرانی جس کی بے رنگ کلائیاں میرا رستہ روکتی ہیں... بتاؤ، مجھے اس دوراہے پہ کیوں لائی ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ بتاؤ، میری زندگی میں کیوں آئی ہوں؟" وہ زخمی شیر کی طرح ایک مرتبہ پھر بپھر گیا تھا۔ یوں کہ ماہ رو کی آنکھیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ یہ عون عباس کیا کہہ رہا تھا؟ یہ عون عباس کیا کہنا چاہتا تھا؟

ماہ رو نے کیا کیا تھا؟ کس کا دل اجاڑا تھا؟ کس کو برباد کیا تھا۔ کس کی آنکھوں میں ویرانی بھری تھی؟ کیا فریحہ؟ مگر یہاں فریحہ کا کیا ذکر؟ فریحہ کیوں؟ اور یہ عون فریحہ کا نام کیوں لے رہا تھا؟ اور پھر خوف و ہراس کی آخری حد سے پھسلتے ہوئے اچانک ماہ رو کی نگاہ سے سیاہ پردہ کھسک گیا۔ اسے ثنا کی باتیں یاد آگئی تھیں۔ اسے گھر والوں کی اذیت، خاموشی اور دکھ کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی یہ گھر جو شادی والا نہیں... مگر والا لگ رہا تھا۔ یہاں لوگ تھے، مہمان بھی تھے، مگر بجھے بجھے۔ یہاں نئی دلہن آئی تھی، مگر وہ حقیقی جوش، ولولہ اور نئی دلہن کی آمد سے ہونے والی چہل پہل اور رونق مفقود تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظر چراتا پھر رہا تھا اور ماہ رو نے اس گھر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے خود بھی ابٹن، مہندی، بیلے، گیندے کی خوشبو محسوس کی تھی۔ تو کیا اس گھر میں کل کسی کی مہندی تھی؟ گزرے ہوئے کل؟ جب وہ اسپتال میں بے ہوش پڑی تھی؟ ماہ رو کا سوچ کی انتہا۔ جیسے سانس رکنے لگا تھا۔ دل بند ہونے لگا تھا۔ جان نکلنے لگی تھی۔ کیا فریحہ کی عون کے ساتھ شادی ہو رہی تھی؟ جو مہندی کی رات ٹوٹ گئی تھی؟ فریحہ کی شادی کیوں ٹوٹی؟ بارات کیوں نہیں آئی؟ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کا سوال عون عباس کی آنکھوں میں سم قاتل بھر رہا تھا۔

"اور آج وہ اکیلی ہے۔ اپنی ذات کی بت کدے میں تنہا بیٹھی نصیب کی اس ستم رسیدگی پر آنسو بہا رہی ہے اور میں یہاں شب زفاف سجا کر بیٹھ جاؤں؟ یہ تم ہو سکتی ہو خود غرض، خود پسند، تنگ دل اور کمینی۔ اور یہ تم ہو سکتی ہو شاطرانہ چالیں چلانے والی، کسی اور کے حق کو چھیننے والی۔ اپنا آپ طشتری میں رکھ کر پیش کرنے والی۔ میرے نزدیک تم جیسی عورتوں اور طوائفوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح نفس پرست عورتیں ہوتی ہیں۔" اس نے ماہ رو کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر ایک مرتبہ پھر باتوں سے خنجر چلائے تھے یوں کہ اس دفعہ ماہ رو بھی خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ جب بات کردار پہ آئی تو ماہ رو بھی پوری جان سے چلا اٹھی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ، تم کون ہوتے ہو، مجھے طوائف بولنے والے۔ مجھے کریکٹر لیس کہنے والے... کیا تم عورتوں کے کریکٹر سرٹیفکیٹ پاس کرتے ہو؟ تم نے میرے ساتھ اتنا روڈ اینڈ ربش بی ہیویئر (مغرورانہ اور فضول رویہ) روا رکھا۔ میں خاموش رہی۔ تم نے مجھے تاچر کیا میں چپ رہی۔ تم بلاوجہ مجھے "برا" کہتے جا رہے ہو... اب کریکٹر کو گندا کہنا شروع کر دیا۔ کیا میری تھانوں میں تصویریں لگی ہیں؟ یا میں نے فحاشی کے اڈے بنا رکھے تھے؟" وہ بھی ماہ رو سرفراز تھی۔ جب بولنے پہ آئی تو رکی نہیں تھی۔ بولتی چلی گئی تھی۔

"اور تم فریحہ کے کس ملال، غم، الم اور رنج میں ہو؟ میں نے فریحہ کے ساتھ کیا کیا؟ اگر فریحہ کی شادی تمہارے ساتھ نہیں ہو سکی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو نہیں رکوائی؟" وہ بھی دلہناپے کا روپ بھلا کر پھٹی پھٹی آواز میں روتے ہوئے غرائی تھی۔ پھر اب کون سی دلہن اور کون سا دلہناپا؟ ماہ رو کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنا یہ حسین روپ خود بگاڑ ڈالے۔ اس زرتار لباس کو آگ میں جھونک آئے۔ وہ اس کے ایک ایک لفظ کو سنتا رہا۔ تو لتا رہا... پھر غضب ناک ہو کر چیخ پڑا۔

"واہ ری بے خبری؟ واہ ری چالاکی؟ تم نے نہیں رکوائی؟ اس معصومیت پہ ساری دنیا نہ مرجائے۔ بہت زہریلی ناگن ہو؟ جب تمہارا باپ سارے زمانے میں پرسے لیتا پھر رہا تھا اپنی بیٹی کی عزت لٹنے پہ ڈھونڈورا پیٹ رہا تھا اور میرے باپ کے سامنے صف ماتم بچھا رکھی تھی۔ میرے باپ کو ساہو کاروں کے بازار سے گھسیٹ کر اسپتال لے گیا تھا اور وہاں جو اس نے ماتم کیا۔ رونا ڈالا۔ پورے عالم میں اپنا اور ہمارا تماشا لگوایا اس سارے ڈراپ سین کے بعد تم کیا سمجھتی ہو مجھ جیسے بدکردار اغوا کار اور غنڈے سے چاچا اپنی بیٹی بیاہ سکتے تھے؟ یہ شادی تکمیل تک پہنچ سکتی تھی؟ قطعی نہیں۔ پھر یوں ہوا۔ تمہاری تمناؤں کے عین مطابق شادی والا گھر مرگ میں بدل گیا۔ یوں لگا، میرا ہی جنازہ اٹھ گیا ہو۔ ہر طرف رونا' آہیں' چیخیں' بکواس' طنز باتیں اور میرے باپ کا وہ جلال۔۔ جو مجھے کبھی بھولتا ہی نہیں۔ کبھی بھولے گا بھی نہیں۔ زندگی کی آخری سانس تک یاد رہے گا۔ وہ بے اعتباری' جو انہوں نے مجھ پہ کی' وہ طمانچے جو انہوں نے مجھے مارے۔ میں تو ابھی وہ پہلا طمانچہ نہیں بھول سکا تھا جو پلازہ کے دفتر میں مجھے میرے باپ نے مارا تھا۔ اس وقت جب تم اپنی سو کالڈ محبت کا ماتم کر کے گئیں ۔ اور میں نے تمہیں دفتر سے نکال دیا تھا۔ تب میرے باپ نے تمہیں دیکھ لیا۔ اور یہ تمہاری ہی خوش نصیبی تھی کہ میرے باپ نے تمہیں خود دیکھ لیا۔ انہیں کسی اور ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا ہے۔ پھر وہ دوسرا طمانچہ۔ جو میرے منہ پہ بھرے مجمع میں پڑا تھا۔ کیا اس طمانچے کی گونج میں بھلا سکتا ہوں؟ اس ذلت' اس توہین اور اس بے عزتی کو بھول سکتا ہوں.... ہرگز نہیں.... اور یہ طمانچے اسی بے عزتی کے بدلے میں تمہیں بطور رونمائی پیش کر رہا ہوں کیونکہ رونمائی کا تحفہ دینا ہمارے معاشرے کا پرانا رواج ہے۔ ہر دلہن کو اس کی حیثیت کے مطابق تحفہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ تم اپنی حیثیت اور قابلیت کی کیٹگری میں آتی ہو۔ سو تمہیں بالی' چوڑی' گہنوں کے بدلے میں طمانچے کا تحفہ دیا جارہا ہے تاکہ تم عمر بھر نہ بھلا سکو۔ ہمیشہ یاد رکھ سکو۔" عون نے ایک ہی سانس میں اندر کا سارا غبار' ساری بھڑاس نکال لینے کے بعد ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا اور وہ درد و کرب کی اذیت کو سہتی بلند آواز میں نہیں گھٹ گھٹ کر دیوانہ وار رو رہی تھی۔

اور عون عباس اندر تک سے سارے زہر' آگ' تنفر کو اکھاڑ کر کل تک کے لیے روح تک سرشار اور ٹھنڈا ہو چکنے کے بعد بڑے ہی کروفر کے ساتھ زمین پر اپنے پیروں کی دھمک دیتا باہر نکل گیا تھا۔ اور یاہ رو اپنی قسمت کے اس ظالمانہ موڑ پر انگشت بدنداں تھی۔ اس نے جو چاہا تھا جیسا چاہا تھا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اور شاید فریحہ کی ساری بددعائیں فیض یاب ہو چکی تھیں۔ اگر رونا فریحہ کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا تو سرشار اور خوش ماہ رو بھی نہیں تھی۔ اگر فریحہ برباد ہوئی تھی تو آباد ماہ رو بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اگر عون عباس فریحہ کو نہیں مل سکا تھا تو ماہ رو بھی خالی ہاتھ' خالی دل بیٹھی تھی۔ اور اس نے کہا تھا وہ ساہو کار کا بیٹا ہے۔ ناپ تول میں پورا پورا حساب رکھے گا۔ برابری کی چوٹ پر ضرب مارے گا اور اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہر گزرنے والی رات گزر ہی جاتی ہے۔ چاہے اچھی ہو یا بری۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زخم بھول بھی جائے مندمل بھی ہو جائے تب بھی رویے کبھی نہیں بھولتے۔ رویوں کے زخم ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ سو' رات گزرنے کے ساتھ وقت' لمحے' ساعتیں بھی بدل گئی تھیں۔ اگلا دن بھی چمک کر طلوع ہو گیا تھا کھڑکی کے پار سے سنہرے صبح بھی دریچے کی درزوں سے چھن چھن کر آتی کمرے کو روشنی سے بھر رہی تھی۔ ماہ رو نے تھکی تھکی سوجی آنکھوں کو بمشکل کھول کر گھڑیال دیکھا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹیچ باتھ روم میں

گھس گئی تھی۔ باتھ روم کی طرف آتے ہوئے اس نے کمرے کی کسی بھی طرف نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ اسے بس جلد از جلد فریش کردینے والے باتھ کی طلب تھی۔ اسے تازہ دم ہونا تھا۔ رات بھر کی گھٹن اور حبس کو باہر نکالنا تھا۔ سب سے بڑی بات عون کی گزشتہ رات ہونے والی ہر قسم کی بات اور بکواس کو بھلانا تھا۔ اور یہ ماہ رو کا آخری فیصلہ تھا۔ وہ رات کی کہانی کو رات میں ختم کرچکی تھی۔ جو رات کو ہوا تھا۔ وہ سویرے نہیں ہو سکتا تھا۔ ماہ رو ایسا موقع فراہم بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس لیے کہ ماہ رو نے پیچھے ساری کشتیاں جلاڈالی تھیں۔ اسے مڑکر نہیں جانا تھا۔ عون عباس کی زندگی سے نہیں جانا تھا۔ وہ زندہ حالت میں یہاں آئی تھی اور مرکر یہاں سے جائے گی۔ ایک بات تو طے تھی وہ اسی گھر میں رہے گی اور عمر بھر رہے گی۔ جو کچھ رات میں ہوا تھا۔ وہ اچھا تو کہیں سے نہیں تھا۔ وہ تو بڑا ہی برا اور بدنما تھا۔ پھر بھی ماہ رو اپنے ستم گر کے ایک ایک ستم کو بھلا دینے کا پکا فیصلہ کرچکی تھی۔ وہ پوری رات سوچتی رہی تھی۔ اس نے ہر پہلو کو سوچا تھا جو کچھ ہوا تھا اس میں بے شمار چیزیں ابہام زدہ تھیں۔ ڈھکی چھپی تھیں اور بہت زیادہ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں اٹی تھیں۔ عون نے جو کہا تھا بہت بڑی غلط فہمی کی بنیاد پہ کہا تھا۔ اسے شدید مس گائیڈ کیا گیا تھا۔ ڈیڈی نے ایسا کوئی الزام عون پہ نہیں رکھا تھا۔ کیا وہ خود اپنی بیٹی کو بدنام کرتے؟ ہرگز نہیں۔ عون کو یقینی طور پر کسی نے بھڑکا رکھا تھا۔ اس کے کان بھر رکھے تھے اور ماہ رو کے خلاف کرر کھا تھا۔

وہ گزشتہ شب عون کی کسی غلط فہمی، الزام یا بہتان کو غلط ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی طرف سے کوئی بھی صفائی پیش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تب نہ کوئی صفائی لیتا نہ وضاحت سنتا اور نہ ہی کسی دلیل کو تسلیم کرتا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ یقینی طور پہ اس کا غصہ، دکھ، جلال سب کچھ اپنی جگہ درست تھا۔ اس وقت ٹھنڈے تازہ پانی سے فریش ہوکر وہ بلا کی تازہ دم اور تر و تازہ ہو چکی تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر وہ واش روم سے باہر آتے ہوئے رات کے ایک ایک منظر کو دانستہ بھلا کر نکلی تھی۔

وہ ساری اذیت کو بھلا کر پرسکون تھی۔ اسے پرسکون ہی رہنا تھا۔ کیونکہ وہ عون عباس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں یہاں تک آئی تھی۔ اسے صرف محبت تھی اور عون عباس سے تھی۔ وہ برا تھا یا اچھا؟ اس سے محبت کرتا تھا یا نفرت؟ کوئی بھی سوال اسے اپنے مقصد سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ کوئی بھی رکاوٹ اسے عون عباس سے دور نہیں کر سکتی تھی۔ اور اب ماہ رو سرفراز کو اگلا لائحہ عمل بھی سوچنا تھا۔ اس گھر میں کس طرح اپنی جگہ بنانی تھی اور کس طرح اپنا قیام مضبوط کرنا تھا اس پہ بھی نظر ڈالنی تھی۔ سب سے بڑی بات جو باہر لوگوں کے ذہنوں میں اس کے متعلق عون کی من چاہی بیوی کا امیج بنا ہوا تھا۔ اسے آخری سانس تک برقرار رکھنا تھا۔ اور ماہ رو سرفراز کو ایک من چاہی، جان عزیز بیبی اینڈ بی لوڈ (سہاگ بھری) بیوی کا سوانگ بھی بھرنا تھا۔ وہ عون کے ارد گرد بسنے والوں کو بتا دے گی۔ امیرزادیاں محبت کرتی اور نبھاتی ہیں، جوائنٹ فیملی کا حصہ بھی بن سکتی ہیں اور امیرزادیاں ہر رنگ میں، ہر سانچے میں بھی ڈھل سکتی ہیں اور جو لوگ آج باتیں بنا رہے تھے اور اس شادی کو "دوروزہ" شادی کا ٹائٹل دے رہے تھے ایک دن خود ہی اپنی زبانوں کو بند کرلیں گے۔ ماہ رو عون عباس سے عشق کرکے آئی تھی اور عشق نبھا کر رہے گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔ جند چلی جاتی یا جان نکل جاتی۔ اگر عون عباس قول کا پکا، نفرت میں سچا تھا تو ماہ رو بھی ضد میں پکی اور عشق میں سچی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور وہ ایک ہی رات کے بعد نئی ماہ رو کے روپ میں ڈھل کر منظر عام پہ آگئی تھی۔ یوں کہ اس کے کھلے کھلے حسین، شگفتہ اور دلفریب روپ کو دیکھ کر جو واقعی سمجھ رہے تھے کہ عون، ماہ رو کو طوفانی محبت سے بے

بس ہو کر اپنی شادی توڑ کے بیاہ لایا ہے۔ ان کے یقین پہ جیسے مہر لگ گئی تھی۔

"میں تا کہتی تھی۔ آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسا؟ گھر میں ماں باپ نے رشتہ پکا کیا اور وہ باہر آنکھیں لڑا آیا۔" کسی رشتے کی خالہ 'مامی نے دوسری کے کان میں گھس کر دل کا "ساز" باہر نکالا تھا۔ دوسری والی دو من کی گردن ہلا کر رہ گئی تھی۔

"ارے ایسے دودھیا لشکارے مارتے حسن کے سامنے اپنی فریحہ کا دیا کیسے جل پڑتا۔ اس کی لو تو اس بجلیاں گراتے روپ سروپ کے سامنے ایک ہی پھونک میں بجھ گئی ہوگی۔" ایک اور مامی نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

"دیکھو' فاخرہ بیٹے کی صفائیاں دیتی نہ تھک رہی تھی۔ میرا بچہ ایسا نہیں۔ نہ دل کا کچا ہے نہ قول کا۔ یہ بس تقدیر کا کوئی ہیر پھیر تھا جو سارا کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔" پہلی والی بے جمالو ٹائپ عورت نے عون کی امی کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

"ارے اس ہیرے کے سامنے کوئی تانبا کس طرح سے ٹھہرتا؟ عون کی تو سدھ بدھ بھلادی ہوگی۔"

"اور دیکھو' لڑکی میں بھی حیا نہیں۔ گیلے بال کمر اور گلے میں ڈالے' دوپٹا ندارد۔۔۔ کیسے گھر میں گھوم رہی تھی۔" ایک آنٹی نے جیسے کلیجے پیٹ لیے تھے۔

"اتنی حیادار ہوتی تو اس انداز میں آتی؟ جانے اندر ہی اندر کیا معاملہ ہو؟ کیا خبر' عزت بچانے کے لیے یا چند ماہ بعد بنا شادی کے دادا دادی بننے کے خوف سے اسے اٹھا لائے ہوں۔" کسی مامی نے ٹھٹھا لگایا تھا۔ باقی سب کو بھی اس بات میں بڑا ہی لطف آیا۔

"ٹکے گی نہیں۔۔۔ دیکھ لینا۔۔۔ عیاش امیرزادی ہے۔ آج اس ڈالی پہ تو کل کسی اور ڈالی پہ۔۔۔ رنگ رنگ کے مردوں کا سواد پڑا ہو تو گھر نہیں بنا کرتے۔" بی جمالو صاحبہ نے پھر سے گل افشانی کی تھی۔

"تم عون کو نہیں دیکھتی۔ کیا بیبا اور معصوم بنا کرتا تھا اور کرتوت شیطانوں سے بدتر۔۔۔ اپنے ہی چاچا کی عزت خاک آلود کر ڈالی۔ کیا بھروسا اس اولاد کا۔۔۔ پکڑ کے ماں باپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا۔ منہ چھپاتے پھرتے ہیں بے چارے۔۔۔" کسی نے چھالیہ کتر کر پان بنایا۔ گلوری منہ میں ڈالی اور عزت داروں کی پگڑیوں میں تھوک دیا۔ "اور تم نے حاجی قیصر کی بیٹی کا سنا جو۔۔۔" اب نیا قصہ چھڑ گیا تھا۔ اس معاشرے کا یہی دستور تھا۔ یہی روش تھی اور اس معاشرے کے لوگ بھی یہی تھے۔ چار دن ایک قصے کو مرچ لگا کر دور دور تک اچھالتے پھر کسی نئی کہانی کے پیچھے چل نکلتے۔ نئے لوگ' نیا قصہ' نئی کہانی' نیا لطف' نیا مزہ۔۔۔ وقت گزاری کے نئے انداز۔۔۔ لیکن ایسے لوگ یہ تک نہیں جانتے تھے کہ جن لوگوں پہ یہ کیچڑ اچھالتے تھے ان پہ یہ سب بکواس کس کس انداز پہ اثر کرتی تھی؟ دیوان عام میں اسی کاؤچ پہ لیٹا عون زہرخند لہجے میں سوچتا رہا تھا کیونکہ وہ کسی کی زبان روکنے پہ قادر نہیں تھا اور نہ بندے بندے کو پکڑ کر اپنی صفائی دے سکتا تھا۔ وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر بس سلگ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے قد آدم آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لے کر خود پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ خوب صورت کاٹن کی امبرائیڈڈ شرٹ میں اس کی دودھیا رنگت بہت چمک رہی تھی۔ اس شرٹ کی سلیوز (آستینیں) برائے نام تھیں اور جو تھیں وہ انتہائی مہین تھیں چونکہ یہ ممی نے اس کی چوائس کو سامنے رکھ کر شاپنگ کی تھی سو سارے لباس ایسے تھے کچھ کی تو سلیوز سرے سے تھی ہی نہیں۔ کچھ فراکس تھے' کچھ میکسیاں اور کچھ اسکرٹس۔ ان میں ٹراوزر اور ٹاپ بھی موجود تھے۔ وہ سلیکشن کے معاملے میں سوچتی رہ گئی تھی۔ اس گھر کے ماحول کو سامنے رکھ کر اسے بہت سمجھ سوچ کے ڈریسنگ کرنا ہوگی۔ امبرائیڈڈ ریڈ شرٹ کے ساتھ ریڈ ٹائٹس اور ریڈ ہی نفیس آرام دہ چپل پہن کر اس نے لمبے حسین ریشم ایسے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پھر کمرے میں نگاہ ڈالی۔۔۔ پورا کمرہ صاف شفاف اور چمک رہا تھا جانے کس نے صفائی کی تھی؟ جب وہ باتھ

لے رہی تھی تب ہی کوئی صفائی کر گیا تھا۔ باتھ لینے کے بعد جب وہ باہر نکلی تب ہی اس کی نگاہ صوفے پہ پڑی تھی۔ اس وقت ماہ رو کو صوفے پر عون سویا دکھائی دیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ شاید وہ فجر کے بعد آیا تھا اسے اس کی امی نے بھیجا تھا یا پھر خود ہی مہمانوں کا خیال کر کے واپس آگیا تھا۔ جو بھی وجہ تھی کم از کم ماہ رو کو اس کی موجودگی کچھ ڈھارس پہنچا گئی تھی۔ اسے کسی کی سوالیہ نظر کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ اس وقت بڑے لاپروا انداز میں آڑھا ترچھا پڑا سو رہا تھا۔ چونکہ صوفہ بھی جہازی سائز تھا سو اسے سونے میں دشواری نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کا ایک پیر اور دایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ ماہ رو کے من میں نہ جانے کیا آئی تھی۔ وہ عون کے قریب آگئی۔ کچھ دیر وہ بے خیالی میں عون کے پاس کھڑی رہی۔ وہ اس کے خوب صورت تیکھے کھڑے کھڑے مغرور نقوش کو دیکھتی رہی۔ اور بہت کچھ سوچتی رہی۔ ماہ رو نے اپنی ہی سوچ کو جھٹکا دیا اور ذرا سا جھک کر نیچے ہوئی۔ اس کوشش میں ماہ رو کے سارے ریشمی بال دائیں کندھے سے ہوتے ہوئے عون کے منہ پر آگرے تھے۔ نیم گیلی، مشک بار سی زلفوں کی ٹھنڈک اور خوشبو کی تاثیر نے عون کو آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا تھا اور وہ جو اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھا رہی تھی لمحہ بھر کے لیے بوکھلا سی گئی۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ اچانک سیدھی ہوئی اور بازو تک ہوا میں چھوڑ دیا۔ جو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دوبارہ اپنی جگہ پہ پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ عون اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو سارے تیر بھی کمان میں سیدھے کر لیے تھے۔ کچھ سنبھل کر وہ خجل سی ماہ رو سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوا۔

"رات کی تمام عزت افزائی بھول کر صبح سویرے ہی اداؤں کے پنجے تیز کر لیے تم نے۔ ظاہر ہے کوئی اور تو تم میں مجھے متاثر کرنے کے لیے خوبی ہے نہیں.... ایک حسن کا جال ضرور ہے جس میں پھانسنے کی کوشش میں ہر حد کو آزما ڈالوگی۔" ماہ رو اس کے کاٹ دار لفظوں کا ہر وار سہہ کر کچھ خفیف سی ہو گئی تھی چونکہ رات کی نسبت وہ اتنا بھڑک نہیں رہا تھا۔ اس لیے ماہ رو کو کچھ ڈھارس سی ہوئی تھی۔

"تمہارا بازو لٹک رہا تھا.... میں تو آرام سے اوپر اٹھا کر...." ماہ رو نے صفائی دینی چاہی پر عون نے بیچ میں ہی اچک لیا تھا۔

"لٹک ہی رہا تھا.... کٹ تو نہیں گیا تھا۔ جو تم فرسٹ ایڈ دینے بھاگی بھاگی چلی آئی۔ اوپر سے اپنی زلفوں کو آزاد چھوڑ کر ان کا بھی جادو آزمانا چاہا...." وہ بھی کیسے کیسے فضول طنز کر رہا تھا۔ ماہ رو شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ اسے شرمندہ دیکھ کر وہ بھی رہ نہیں سکا تھا۔

"عجیب حیرت کی بات ہے۔ لوگوں کو کسی بات پہ شرمندہ ہونا بھی آتا ہے۔" وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا کچھ لاپروائی سے بولا تھا۔ کل کی طرح آج صاحب بہادر زہر نہیں پھونک رہے تھے۔ شاید گرج برس کے بعد کچھ دیر تک مطلع صاف تھا۔ کسی بھی وقت غبار آلود ہونے کے امکانات تاہم ضرور تھے۔ پھر اسے ماہ رو کو سرتاپا دیکھنے کا بھی خیال آگیا اور دوسرے ہی لمحے مزاج یار کے موسمی حالات خراب ہوتے چلے گئے تھے۔ اس کی سوجی آنکھوں میں جو نیند کی کمی کا شکار لال بوٹی سی ہو رہی تھیں اس وقت ناگواری سے اور بھی لال ہو گئیں۔

"یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ کوئی شریفانہ لباس نہیں تھا؟ اور اس کی آستینیں کہاں ہیں؟ دوپٹا بھی نہیں۔ شیم آن یو۔ میرے گھر میں بزرگ مرد اور جوان بھائی موجود ہیں۔ مہمان بھی آجا رہے ہیں اور تم اشتہاری ماڈل بنی گھر کے اندر باہر گھومتی رہوگی.... تمہیں سارے رولز ریگولیشنز (اصول وضوابط) سکھانے پڑیں گے۔ آج ہی کان کھول کر سن لو۔ ایسے بے ہودہ کپڑوں میں گھر سے باہر جانا تو دور اس کمرے سے باہر بھی نہیں نکلوگی۔ ورنہ میں تمہارا حشر کر دوں گا۔" وہ خاصا گرج کے ناگواری بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ماہ رو لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ بھلا اسے کیا

جواب دیتی اس کے سارے ڈریسز ایسے ہی تھے۔
"اور جاؤ کوئی دوپٹا امی سے لے کر پہنو۔" وہ مزید بھی اس کی درگت بناتا، لیکن بیڈ روم کے دروازے سے آتا شور سن کر لب بھینچتا واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور ماہ رو ایک مرتبہ پھر خود کو باور کروا رہی تھی کہ اسے عون سے محبت تھی اس کی خوبیوں یا کمزوریوں سے نہیں۔ اگر وہ اسے ٹوک رہا تھا۔ غصہ کر رہا تھا تو کرتا رہے۔ ماہ رو کو دل پہ نہیں لینا تھا۔ اور بس نہیں لینا تھا۔ اس نے سارے آنسو اندر ہی اندر پی لیے تھے۔ اور پھر بڑی بشاشت سے کھلے ڈور سے آتی ماہم کے گلے سے جا لگی تھی۔ ایک دم اس اجنبی ماحول میں کسی بہت اپنے کو پا کر اس کی کیا کیفیت تھی۔ وہ لفظوں میں بتا نہ پاتی۔ ماہم نے بھی چٹاچٹ اس کے رخسار چوم لیے تھے۔
"کہاں ہیں تمہارے سرتاج؟ اتنی کالز کی تھیں، مگر صاحب بہادر نے فون نہیں اٹھایا۔ بتانا تھا کہ ناشتا کرنے کا تکلف مت فرمائیں۔ ہم ناشتا لے کر آرہے تھے اور تم نے کچھ ٹھونس تو نہیں لیا؟" ماہم فل اسپیڈ سے بولتی بہت کھلکھلا رہی تھی۔
"سیل شاید سائلنٹ پہ تھا۔" ماہ رو کو بتانا پڑا۔
"اور تمہارا؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔
"کلچ (بٹوہ) میں۔" اس نے جان کر چہرے کا رخ موڑ لیا تھا تاکہ ماہم اس کے چہرے سے کچھ کھوج نہ لے۔ کچھ اخذ نہ کرلے۔
"اور دولہا بھائی؟" ماہم نے شرارتاً پوچھا۔
"باتھ روم میں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔
"ویل، تم اپنے سرتاج کے ساتھ باہر آجاؤ۔ بڑے ہال میں تمہاری ساس ماں نے ناشتا چنوا دیا ہے۔ آج لائف میں پہلی مرتبہ دسترخوان پر بیٹھ کر ناشتا کرنا ہوگا۔ ہم سب کے معدے بھی خالی ہیں۔ دیر مت لگانا، جلدی آنا۔" ہنستی مسکراتی ماہم جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔ تب اس نے جیسے کھل کر سانس لیا تھا۔ صد شکر کہ اس کا دھیان ماہ رو کے چہرے پر نہیں پڑا تھا۔ ورنہ وہ کتنی ہی وضاحتیں دیتی تب بھی ماہم کو مطمئن نہیں کرسکتی تھی۔ معاً" عون بھی باہر نکل آیا تھا۔ ماہ رو کو اسے ماہم کے متعلق نہیں بتانا پڑا تھا۔ کیونکہ ثنا خود آکر اسے باہر آنے کا کہہ گئی تھی۔ ماہ رو کہتی تو شاید وہ مروت نبھانے کے لیے اور دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بھی نہ جاتا۔ تاہم اپنی بھابھی کا احترام اس پر لازم تھا۔ وہ انکار نہیں کرسکا۔
ماہ رو بھی اس کے انتظار میں رکی ہوئی تھی۔ جب وہ بال بنا کر، پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد باہر جانے لگا تب غیر ارادتاً" ماہ رو پہ نگاہ پڑی تو رک گیا۔ وہ خاصی تذبذب کا شکار کھڑی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
"آپ باہر چلیں گی یا کسی شاہی سواری" کو بلایا جائے؟" اس کا انداز کاٹ دار قسم کا طنزیہ تھا۔ ماہ رو جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
"تمہارے گمان میں ہوگا میں تمہارا ہاتھ پکڑوں اور شہزادی صاحبہ کو سج سج چلاتا باہر لے جاؤں۔ لیکن اس بھول میں نہ رہنا۔ اس گھر میں ایسے بے شرمانا رواج نہیں ہیں۔" وہ زہر خند ہوا اور اب کی دفعہ جھڑک کر بولا۔ "چلو"۔
"میرے پاس دوپٹا نہیں۔ تم اپنی امی سے لا دو۔" بالآخر اس نے باہر نہ جانے کی وجہ بتا دی تھی۔ عون کی بھنویں تنی تھیں۔ پھر تھوڑا اچک کر نارمل ہوئیں۔ وہ اس کے تذبذب کو جان کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ "ڈرامہ باز۔"

✲ ✲ ✲

ہال کمرے میں لمبا سا دسترخوان دیکھ کر ماہ رو حیران رہ گئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک لوازمات سجے تھے اور کھانے والے ندارد۔
"اتنے بڑے دسترخوان پر بس ہم چار لوگ۔" ماہ رو نے بے ساختہ ماہم کے کان میں گھس کر کہا تھا۔ پھر بھی اندر آتی ثنا نے اس کی بات سن لی تھی۔
"چار کیوں؟ ماشاء اللہ سے۔ ابھی پوری پلٹن

آجاتی ہے۔ بے فکر رہو۔" ثنا کے کہنے کی دیر تھی۔ ناشتا لگنے کا طبل بجتے ہی گھر کے کونوں کھدروں سے ایک ایک فرد اور بچہ خود بخود نکل آیا تھا۔ کسی کو بھی جا کر بلانا نہیں پڑا تھا۔ مہمان بھی موجود تھے۔ میزبان بھی۔ تایا رحمان کے آتے ہی ماہ رو احتراماً" کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ عون کے ابو تھے انہوں نے آگے بڑھ کر ماہ رو کے سر پہ ہاتھ رکھا' پیار کیا اور مٹھی بھر پیسے بھی دیے۔ وہ پیسے لیتے ہوئے کچھ ہچکچا گئی تھی۔ تب مریم نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ بڑا سا انار کے جوس کا گلاس پکڑ کے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

"بزرگوں کا تبرک اور پیسہ کبھی نہ چھوڑو۔ جتنا ملے ہڑپ کر جاؤ۔" مریم کی بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔ اس کے چھوٹے دیور یاسر نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہماری بزرگ تو آپ ہیں بھابھی! ذرا اپنا چھوڑا تبرک مجھے بھی دیں۔ فریش انار کے جوس میں کیا ذائقہ ہوتا ہے؟ آج اس کا اندازہ تو کروں۔" وہ مریم کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر بولا تھا۔ وہ بے چاری ارے ارے کرتی رہ گئی تھی۔ یاسر نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھالیا۔

"واہ۔ کیا لاجواب ٹیسٹ تھا۔ اسے کہتے ہیں خالص انار کا جوس۔" اس نے خالی گلاس ہوا میں لہرایا۔

"اور جو پہلے چڑھایا تھا وہ کیا تھا؟" عاشر نے اسے دھمو کا جڑا۔

"وہ۔" اس نے "وہ" کو لمبا سا کھینچ کے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ "اس میں تو بھابھی نے چینی اور پانی ملا کر دیا تھا۔ یقین مانو' روزانہ ایسے ہی کرتی ہیں۔ خود خالص انار کا جوس پی پی کر انار وانار ہو چکی ہیں۔ ہمیں ملاوٹ شدہ دیتی ہیں۔ دیکھو' میری رنگت کیسی پھیکی پڑ گئی ہے۔" یاسر نے منہ لٹکا کر مریم پہ ایسا الزام رکھا کہ وہ تنک کر بول پڑی۔

"تم دیوروں سے یہی صلہ ملے گا' نا۔ پہلے ایک الزام دیتا تھا۔ بھابھی! مینگو شیک میں پانی ملا لائی ہو۔ آم کی جگہ کدو گرینڈ کر لاتی ہو۔ چائے میں دودھ کی جگہ میٹھا سوڈا ڈالا ہے۔ یا سرف کے جھاگ میں پتی ڈال کر ابال لائی ہو۔ اگر انڈا فرائی کر کے سامنے رکھوں تو کہتا۔ بیچ میں سے آدھا خود اڑا گئی ہو۔ صد شکر کہ اس کی تو بیوی آگئی۔ وہ جانے اور اس کا شوہر جانے۔ خود اٹھائے اپنے نخریلے شوہر کے نخرے۔ نہ کپڑا پسند کرتا ہے۔ نہ کھانا پکا ہوا۔ ہر چیز میں سو سو کیڑے۔" مریم تو خاصی تپی ہوئی بیٹھی تھی۔ لحہ بھر میں شروع ہو گئی تھی معا" عون بھی اپنی پکار سن کر آگیا تھا۔ ماہ رو کا دل اسے دیکھ کر دھڑک اٹھا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھمالی تھی۔

"مریم بھابھی! خاطر جمع رکھیں۔ دیور کے ساتھ اب دیورانی کے نخرے بھی اٹھائیں گی۔ ہماری بنو کو تو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔ باقی کاموں کی فہرست تو پھاڑ ہی دیں۔ چائے کے نام پہ اسے چائے پینے کا پتا ہے۔ کھانے کے نام پہ کھانا کھانے کا پتا ہے۔ اگر کھانے کا کہیں گے تو وہ آپ کو کھا کر دکھا دے گی۔ پکوانے کی بات نہ کرنا۔" ماہم اپنی سہیلی کو مشکل میں گرفتار دیکھ کر میدان میں کود پڑی تھی۔ سعدیہ' ہما اور باقی سب نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ ماہم آتے ہوئے یونی ورسٹی فیلوز کو بھی لے آئی تھی۔ سمیرا' فرح اور عمارہ بھی تھیں۔ سو خوب رونق لگ گئی۔

"نکمے پن کے دعوے دارو' ہمیں ٹرینڈ کرنے کے سارے گر آتے ہیں۔" عون نے ماہم کو جواب دیتے ہوئے ماہ رو پہ صاف طنز کیا تھا۔ وہ سمجھ کر لب بھینچ گئی تھی۔

"شرط یہ ہے کہ سکھانے والے آپ ہوں۔" ماہم نے برجستہ کہا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ ایسا سکھاؤں گا کہ عمر بھر بھلا نہ سکے گی۔" اس نے بظاہر مسکرا کر کہا تھا۔ لیکن ماہ رو کے دل پہ گھونسا پڑا۔ وہ محفل میں بھی کچوکے لگانے سے باز نہیں آرہا تھا۔

"میرا دوسرا راؤنڈ اس کی ٹریننگ کے بعد لگے گا۔ میں بھی تو دیکھوں گی۔ آپ کا دعوا کہاں تک ٹھیک ثابت ہوا۔" ماہم نے جیسے اسے چیلنجنگ انداز میں

چھیڑا تھا۔

"ہم قول کے کچے نہیں، جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ اپنی سہیلی سے پوچھ سکتی ہو۔" عون نے مسکرا کر کہا۔ گو کہ اس کی باتیں سب انجوائے کر رہے تھے لیکن ماہ رو تو جانتی تھی کہ وہ بات بہ بات طنز کر رہا ہے۔

"کل سے ہماری نئی بھابھی کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔" یاسر نے ٹکڑا لگایا۔

"دیکھتے ہیں، ڈیلی ٹیسٹ، ویکلی کوئز، منتھلی رپورٹس اور فائنل ٹرم میں ماہ رو کتنے کتنے مارکس لیتی ہے۔" ہما بھی ماہ رو کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

"بائی دا وے، اس ٹریننگ کی ڈیٹیلز (تفصیلات) بھی بتائی جائیں۔ پکوائی اور دھلائی سے لے کر کہاں تک اس کی لمٹ (حد) ہے؟" ماہم کو ہی اچانک اتنی اہم بات پوچھنے کا خیال آگیا تھا۔ کیونکہ اسے لگ رہا تھا۔ عون کچھ بھی مذاق میں نہیں کہہ رہا۔ وہ ہر بات ماہ رو کو لگا لگا کے کر رہا تھا۔

"لامحدود۔" جواب بھی عون نے دیا۔ ماہم کو جیسے شاک لگا تھا۔ وہ ایک دم چلا اٹھی۔

"عون بھائی! خدا کا خوف کھائیں۔ آپ بیوی کو لے کر آئے ہیں یا ایک باورچن، دھوبن، سوئیپر اور وغیرہ وغیرہ کو۔؟"

"چونکہ میرا میتھ بہت اچھا ہے۔ اور میں جوڑ توڑ، حساب کتاب میں کمال رکھتا ہوں۔ سو سارے پہلوؤں پہ غور کر کے لایا ہوں۔ مجھے لگا تھا، تھوڑی ٹریننگ کے بعد یہ کک میڈ، سوئیپر کے عہدے تک پروموشن لے سکتی ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔ یوں کہ ہال کمرے میں چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگا۔ جبکہ ماہ رو نے بڑی زخمی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ نہ ہو حساب میں اچھا ہونے کے دعوے کرتے کرتے آپ کا اپنا حساب ہو کر کورٹ مارشل ہو جائے۔" ماہم نے بھی لطیف سا طنز کیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس کی کلف لگی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔

"دوسروں میں تبدیلی لاتے لاتے آپ خود سرتاپا بدل گئے تو۔" سمیرا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے لہجے میں واضح طنز تھا۔

"کبھی نہیں۔۔۔ بدلتے تو وہ ہیں جنہیں اپنی کمزوریوں کو چھپانا ہوتا ہے۔ وہ تبدیلی میں خود کو چھپا کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان پہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ تاکہ انہیں۔ ریجیکٹ نہ کر دیا جائے۔ یہ لوگ ریجیکشن سے ڈرنے کے لیے خود میں بدلاؤ لاتے ہیں۔" عون نے گہرے کاٹ دار لہجے میں ماہ رو پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا تھا۔ وہ امی کے کرینکل کریپ دوپٹے کو بمشکل سنبھالتی کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہی تھی۔ بار بار شانوں سے پھسلتا دوپٹا ٹھیک کرتی۔ دوپٹا لینے کی عادت جو نہیں تھی۔ عون کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نیور مور۔" (کبھی نہیں) ماہم نے بے ساختہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میں آپ سے ایگری (متفق) نہیں کرتی۔ یعنی اچھی تبدیلی کے عمل کو بھی آپ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" یہ ماہم کا ہی جگرا تھا جس نے عون سے منہ پر اختلاف کر لیا تھا۔ مریم اور ثنا ہنسنے لگی تھیں۔

"ان فیکٹ، (دراصل) تم میرے پوائنٹ آف ویو کو نہیں سمجھ رہیں۔ ہر تبدیلی میں فرق ہوتا۔ کوئی تبدیلی اپنے لیے ہوتی ہے اور کوئی دکھلاوے کے لیے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کچھ لوگ وقتی طور پہ خود کو تبدیل کر کے، خود کو دوسروں کی نظر میں

اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت بڑے ملمع ساز ہوتے ہیں۔" عون نے ایک مرتبہ پھر ماہ رو پہ اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کی توجہ ان کی باتوں کی طرف نہیں تھی۔ خیالوں میں گم ہونے کی وجہ سے اس کا دوپٹا دونوں شانوں سے پھسل کر گود میں جاگرا تھا اور اسے خیال تک نہیں تھا۔ عون نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ درپردہ وہ ماہ رو کو ہائپوکرائٹ کا لقب دیتے ہوئے اس وقت خود بہت بڑا ملمع ساز لگ رہا تھا۔ جس نے اپنی شخصیت کو پرت در پرت چھپا رکھا تھا۔ جب دل چاہتا۔ موقع یا حالات کی مناسبت سے پرت اتار کر ویسا ہی خود ظاہر کرتا۔ جیسے وہ اندر باہر سے ایک ہو۔

"اینی وے، آپ سب کا شکریہ۔ چونکہ ولیمہ تو ہے نہیں۔ سو، پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" وہ جینز جھاڑتا۔ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یوں کہ ماہم چائے پیتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کرتی چیخ پڑی تھی۔

"کہاں چل دیے؟ رکیے ذرا، ہم ماہ رو کو لینے آئے ہیں۔" ماہم بھی کھڑی ہوتی۔ "اپنی مسٹریس (منظور نظر) کو ہمارے ساتھ بھیجیں۔" اس کی پکار پہ عون نے بے ساختہ رکتے ہوئے اک نظر ماہ رو کے خاموش سراپے پہ ڈالی تھی۔

"وہ کس خوشی میں؟" اس کا انداز طنزیہ تھا۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا رک سا گیا۔ ماہ رو بھی بے چین ہوگئی تھی۔

"یہ دستور زمانہ ہے جناب! ان فیکٹ، ماہ رو کے ڈیڈی بھی اداس ہوگئے ہیں۔" ماہم نے مسکرا کر بتایا۔

"محض ایک ہی رات میں؟" عون کا انداز سابقہ ہی تھا۔ دھیما اور طنز بھرا۔

"وہ اس کے بغیر کبھی رہے نہیں نا۔" ماہم نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ عون نے لحہ بھر کے لیے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔ پھر بھنویں اچکا کر بولا۔

"تو ماہ رو کے بغیر رہنے کی عادت ڈالیں اب۔ ایسے تو نہیں چلے گا۔ ہر بڑے تہوار پہ ملنے جایا کرے گی۔ ڈیڈی صاحب کو بتا دینا۔" اس کا انداز اٹل سا تھا۔

"واٹ؟" ماہم ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ تو فاؤل (غلط) ہے۔"

"یہ فاؤل نہیں، ہمارے گھر کا رواج ہے۔ یہاں کی بہویں ہر رواج اور اصول کو اپناتی ہیں۔ مریم اور ثنا سے پوچھ لو، یہ عید کے عید بھی نہیں جاتیں۔" اس نے مبالغے کی حد کردی تھی۔ ماہم کی چیخ و پکار پہ تائی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"بکواس کر رہا ہے۔ کیوں نہیں جائے گی۔" انہوں نے عون کو ڈپٹ کر کہا۔ وہ لب بھینچ کر چپ ہوگیا تھا۔ پھر اس تاثر کو ختم کرتے ہوئے بولا۔

"آج تو امی کی سپورٹ مل گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ مسکراتے لہجے میں پوشیدہ وارننگ دیتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ماہ رو بمشکل ہونٹ کاٹتی اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اسے عون نے باتوں میں اچھی طرح سے جتا دیا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر آئے دن ڈیڈی سے ملاقاتوں والا سسٹم نہیں چلے گا۔ وہ بھرے دل کے ساتھ ماہم کو اپنے روم میں لے کر جارہی تھی۔ جب سمیرا کی اچانک آواز اس کے کان میں پڑی۔

"ہما! آؤ ہم ذرا فریحہ سے مل لیں۔ اس بے چاری کے ساتھ جو ہوا برا ہوا۔ ہم تو پرسہ بھی نہیں دے سکے۔ یہ تو ماہم مجھے گھسیٹ لائی تھی۔ ورنہ میں تو کبھی نہ آتی۔ فریحہ کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے۔ ویسے یار! لوگ بھی کیسے بخت آور ہوتے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں پالیتے ہیں۔ چاہے کسی کی محبت ہو یا محبوب۔ ماہ رو نے تو دن دہاڑے فریحہ کے ارمانوں پر شب خون مارا اور ذرا بھی شرمندہ نہیں۔" اس کی یونی ورسٹی فیلو بڑے جلے کٹے لہجے میں ہما سے مخاطب تھی۔ یوں کہ اندر کی طرف جاتے جاتے ماہ رو کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"فریحہ!" اس کے ہونٹ جیسے کپکپا اٹھے تھے۔ عون کے حوالے سے ایک بھولا ہوا قصہ اچانک یاد آگیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)